الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی
یہ کہہ دے کہ ــــــ میں نہیں جانتا

شمارہ ۱۰۰

مارچ ۱۹۸۵

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۰

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بینک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتقلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی یافت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ حالانکہ قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں (الزمر ۶۷)

اس سلسلے میں ایک حدیث مختلف روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز منبر پر سورہ زمر کی مذکورہ آیت پڑھی :

ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ھکذا بیدہ ویحرکھا یقبل ویدبر۔ یمجد الرب نفسہ انا الجبار انا المتکبر انا الملک انا العزیز انا الکریم (این ملوک الارض) فرجف برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنبر حتی قلنا لیخرن بہ (تفسیر ابن کثیر)

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہے تھے اور آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ اللہ اپنی بزرگی بیان کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں جبار ہوں۔ میں متکبر ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں عزیز وکریم ہوں۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر لرزہ طاری ہو گیا حتی کہ ہم نے کہا کہ آپ منبر کے ساتھ گر پڑیں گے۔

جب ایک آدمی خدا کا حقیقی ادراک کرتا ہے تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جو اوپر کی مثال میں خدا کے رسول کا نظر آتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کو اس وقت حسی طور پر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ تصوراتی طور پر دیکھ رہے تھے۔ مگر خدا کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے آپ کا جسم ہل گیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ آپ زمین پر گر پڑیں گے۔

اسی کا نام خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی معرفت اس مالک کائنات کی معرفت ہے جو سب سے بڑا ہے۔ جو سب سے طاقت ور ہے۔ ایسے خدا کو پانا محض سادہ پانا نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر بھونچال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کی معرفت خدا کو دیکھے بغیر دیکھ لینا ہے۔ یہ اس وقت خدا کے سامنے ڈھ پڑنا ہے جب کہ خدا ابھی زمین و آسمان کا پردہ پھاڑ کر عیاناً انسان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

آہ کس قلم سے لکھا جائے

کوئی جہاز مشکل میں پھنس جائے تو وہ ریڈیو کے ذریعہ خاص سگنل بھیجتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں ایس او ایس (SOS) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم مصیبت میں ہیں، ہماری مدد کرو مگر اس قسم کے سگنل کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ اس کو وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت دے اگر وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت نہ دے تو وہ فضا میں بکھر کر رہ جائے گا۔ وہ ایسا کلام بن جائے گا جس کو بولنے والے کے سوا کسی اور نے سنا ہی نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے اور بولنے والے بھی خدا کے نام گویا "ایس او ایس" بھیج رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ خدایا ظالموں کے خلاف ہماری مدد کر۔ مگر سو سالہ پکار کے باوجود ہماری مصیبت ختم نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم جس خدائی اسٹیشن کو اپنا ایس او ایس بھیج رہے ہیں اس کے نزدیک ہمارے ایس او ایس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ہم خدا سے دوسروں کی بربادی مانگ رہے ہیں مگر خدا اس کا منتظر ہے کہ ہم اس سے دوسروں کی ہدایت مانگیں۔ ہم اپنے قومی مقاصد کے لئے خدا کو پکار رہے ہیں۔ مگر خدا صرف اس پکار کو سنتا ہے جو دینی مقاصد سے نکلی گئی ہو۔ ہم لوگوں کو آگ میں ڈالنے کی دعا کر رہے ہیں حالانکہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگ سے بچانے کی دعا کریں۔ ایسی حالت میں ہمارا "ایس او ایس" خدا کے یہاں کیسے قابل لحاظ ہو سکتا ہے۔ جو فائر بریگیڈ پانی لئے ہوئے بیٹھا ہو اس سے ہم کہیں کہ آگ برساؤ تو وہ کیسے ہماری بات کو سنے گا۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی جنتیں رزرو ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں دوسروں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر نہیں۔ اگر لوگوں کو اللہ کا ڈر ہو تو وہ جان لیں کہ قیامت میں اللہ کی پکڑ سے وہی شخص بچے گا جس نے دوسروں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کی فکر کی ہو۔

لوگوں کے پاس الفاظ ہیں، صرف اس لئے کہ وہ قیامت کی ہولناکی کو دوسروں کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر وہ جانیں کہ وہ خود بھی قیامت کی ہولناکی کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔ خدا کی پکڑ کا خوف ان کو اتنا ہلکان کر دے کہ وہ ہنسنے سے زیادہ روئیں۔ وہ بولنے سے زیادہ خاموش دکھائی دینے لگیں۔

جنازہ کو دیکھ کر

مرحوم کا جنازہ لوگ کاندھوں پر اٹھائے ہوئے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ اور میرے ذہن میں ایک پوری تصویر جاگ رہی تھی۔ مرحوم کے اس آخری سفر میں مجھے انسان اپنے آغاز سے اپنے انجام کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔

آدمی پیدا ہو کر دنیا میں آتا ہے تو فوراً ہی اس کو ماں کی شفقت اور باپ کی سرپرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے درمیان پرورش پاتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہو کر ایک با اختیار انسان کی حیثیت سے زمین پر اپنی زندگی بناتا ہے۔

آدمی کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اب اس کے وہی دوست اور رشتہ دار جو دنیا میں اس کے مددگار بنے ہوئے تھے، اس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور زمین کے ایک ایسے گڑھے میں ڈال کر بند کر دیتے ہیں جہاں آدمی بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے اور اس کا خدا۔

آدمی اب تک اپنے جیسے انسانوں کے سامنے تھا، اب وہ برتر خدا کے سامنے ہوتا ہے۔ اب تک وہ اختیار کی دنیا میں تھا، اب وہ بے اختیاری کی دنیا میں اپنے آپ کو پاتا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب ایک عاجز مطلق ایک قادر مطلق کے سامنے کھڑا ہوگا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز زمین کے اوپر ہوتا ہے۔ ہر روز آدمی کسی نہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر اس کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔

"احساس تو جب ہو جب کہ آدمی کے دماغ میں جنت اور جہنم ہو" میں نے سوچا۔ لوگوں کی سوچ بالکل دوسرے رخ پر چل رہی ہے۔ لوگوں کے ذہن میں دوستی، رشتہ داری، کمانا اور گھر بنانا، جیسے مسائل بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کسی آدمی کو اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔ جب کوئی آدمی مرتا ہے تو وہ اس کے متعلق بس اتنا سوچ پاتے ہیں کہ ایک ساتھی بچھڑ گیا۔ ایک کمانے والا فرد ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ صرف دنیا کے ساتھ انسان کے تعلقات کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کے ساتھ انسان کے تعلقات کو نہیں جانتے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ جنازہ میں انسان کی خدا کے سامنے حاضری کو دیکھیں۔ وہ موت کے سفر میں انسان کے آخرت کی طرف سفر کا مشاہدہ کریں۔

کارخانہ کائنات

آپ کسی انسانی کارخانہ میں داخل ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کے بارہ میں بتایا جارہا ہے۔ اس کے ہر شعبہ میں تعارفی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ آدمی کھڑا ہوا ہے جو آپ کے ہر سوال کا پورا جواب دیتا ہے۔ کارخانہ کی طرف سے آپ کو ایسا تعارفی لٹریچر بھی دیا جائے گا جس میں ضروری معلومات درج ہوں۔

کائنات تمام کارخانوں سے زیادہ بڑا کارخانہ ہے۔ مگر یہاں نہ کہیں کوئی تعارفی بورڈ نظر آتا اور نہ کوئی گائڈ۔ یہاں منصوبہ بندی بھی ہے اور تعمیرات بھی۔ یہاں پیداوار بھی ہے اور پیکنگ اور سپلائی کا انتظام بھی۔ یہاں رسد اور طلب میں تناسب کا لحاظ بھی کیا جارہا ہے اور صنعتی فضلات کو دوبارہ استعمال میں لانے کا اہتمام بھی۔ یہاں ضبط اور توازن کا نظام بھی ہے اور خام سامانوں کی مسلسل فراہمی کا بندوبست بھی۔ یہ سب کچھ ہے مگر نہ کہیں کوئی اعلان کرنے والا ہے اور نہ بتانے والا۔

پہاڑوں کی بلندیاں کائناتی اسٹیج کی مانند نظر آتی ہیں مگر وہاں کوئی بولنے والا نہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں تو شبہہ ہوتا ہے کہ وہ شاید کسی بات کی خبر دے رہی ہیں مگر ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔ بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات کا آلۂ مکبر الصوت ہے جس کے ذریعہ کچھ اعلان کیا جارہا ہے مگر اس کے الفاظ آدمی کے لیے قابلِ فہم نہیں ہوتے۔

"ایمان" کسی آدمی کے اندر اسی خلا کو پُر کرتا ہے۔ وہ آدمی کو کائنات کے بھیدوں کا رازداں بناتا ہے۔ مومن ایک قسم کا سائنس داں ہے۔ سائنس داں بکھرے ہوئے کروں میں نظامِ شمسی کا پتہ لگاتا ہے وہ مادہ کے اندر چھپی ہوئی توانائی کو دریافت کرتا ہے۔ وہ غیر متحرک دھات میں متحرک مشین کو دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح مومن عالمِ ظاہر میں عالمِ غائب کو دیکھتا ہے۔ وہ مخلوقات میں اس کے خالق کو پالیتا ہے۔ وہ نظم کو دیکھ کر اس کے ناظم کا پتہ لگالیتا ہے۔

ایمان جب اپنی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو وہ دعوت بن جاتا ہے۔ دعوت دوسرے لفظوں میں کائنات کے غیر ملفوظ نغمہ کو الفاظ کی صورت دینا ہے۔ داعی خدا کی خاموش نشریات کو باآواز اعلان میں منتقل کرتا ہے۔ وہ خدائی پیغام کو سن کر اسے انسانوں تک پہنچاتا ہے دعوت خدا کی دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔

زندہ قبرستان

میں اسپتال کے اندر کھڑا تھا۔ میرے سامنے طرح طرح کے مریض تھے۔ ہر مریض درد والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تکلیف تھی اور کسی کے پاؤں میں۔ کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا، کسی کی پیٹھ حادثہ کا شکار ہوگئی تھی۔ اسپتال کی دنیا کا ہر آدمی مصیبت زدہ تھا۔ یہاں کا ہر باشندہ انسانی عجز کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

میں نے سوچا "جسم کی کوئی ایک بات بگڑ جاتی ہے تو آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ پھر اس وقت آدمی کا کیا حال ہوگا جب کہ اس کی ساری بات بگڑ جائے گی۔ جب انسان سے اس کی ہر وہ چیز چھن جائے گی جس کو وہ اپنی چیز سمجھ کر سرکشی کر رہا تھا۔

پہلے زمانہ میں آدمی عبرت کے لئے قبرستان جاتا تھا۔ اب اس کو عبرت کے لئے اسپتال جانا چاہئے۔ قبرستان میں "مصیبت زدہ" زمین کے نیچے ہوتا ہے۔ اور اسپتال میں مصیبت زدہ زمین کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ قبرستان میں عبرت کی چیز کو سوچ کر تصور میں لانا پڑتا ہے۔ اور اسپتال میں عبرت کی چیز بالکل زندہ حالت میں آنکھ کے سامنے موجود ہوتی ہے۔

اسپتال گویا زندہ قبرستان ہے۔ اسپتال کی دنیا سراپا عبرت کی دنیا ہوتی ہے۔ کوئی آدمی حادثہ کا شکار ہو کر یہاں آیا ہے۔ کوئی سخت بیماری میں مبتلا ہے۔ کسی کے جسم میں کوئی ضروری چیز کم ہوگئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کراہ رہا ہے۔ کوئی چیخ رہا ہے۔ غرض بے بسی و بے چارگی کے عبرت ناک مناظر ہیں جو اسپتال میں ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ مناظر اس لئے دکھائے جاتے ہیں کہ آدمی ان سے سبق لے۔ وہ دوسروں کی تکلیف میں اپنی تکلیف کا عکس دیکھے۔ وہ جزئی واقعہ میں کل حقیقت کا مشاہدہ کرے۔ وہ دنیا کے واقعہ میں آخرت کے واقعات کا احساس کرلے۔

ایسے مناظر ہر آدمی کے سامنے آتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان سے سبق لیتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سبق لینے کے لئے غیر کی حالت کو اپنے اوپر طاری کرنا پڑتا ہے۔ جو کچھ ابھی پیش نہیں آیا اس کا احساس اس طرح کرنا پڑتا ہے کہ گویا وہ پیش آچکا ہے۔ یہ مستقبل کو حال کے اندر دیکھنا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مستقبل کو حال کے اندر دیکھنے والی نظر رکھتے ہوں۔

خدا کا داعی

ایک سائنس داں ایک بلڈنگ کے اندر ہے۔ اس کے آلات اس کو بتاتے ہیں کہ چند منٹ کے اندر یہاں بھونچال آنے والا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ بلڈنگ کے اندر بعض دوسرے انسانی مسائل بھی ہیں۔ ایسی حالت میں سائنس داں کیا کرے گا۔ اس وقت دوسرے مسائل اس کی نظر میں چھوٹے ہو جائیں گے۔ وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ صرف ایک ہی آواز دے گا ——— لوگو، چند لمحہ میں بھونچال اس بلڈنگ کو ڈھا دینے والا ہے۔ تم لوگ فوراً بلڈنگ سے نکل کر باہر آجاؤ۔ سائنس داں اس وقت بلڈنگ کے مسائل پر تقریر نہیں کرے گا بلکہ وہ بلڈنگ کو چھوڑنے کا مبلغ بن جائے گا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جو کائنات میں ایسے مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں سے وہ ایک طرف ہماری موجودہ دنیا کو دیکھ رہا ہے اور دوسری طرف جنت کے باغ اور جہنم کی آگ کے مناظر بھی اس کو بخوبی طور پر نظر آرہے ہیں۔ ایسا آدمی اس وقت کیا کرے گا۔ وہ کون سی بات ہوگی جس کے متعلق وہ چاہے گا کہ لوگوں کو اس کی خبر دے۔

یقینی طور پر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ دنیا کے مسائل پر تقریر شروع کر دے یا فلاح تمدن کا نسخہ لوگوں کو بتانے لگے۔ اس کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات ہوگی وہ صرف یہ ہوگی کہ لوگو، جہنم کی آگ سے بھاگو اور اپنے آپ کو جنت کا مستحق بناؤ۔

ایک شخص اگر اس سے بے خبر ہو کہ ایک سخت بھونچال اگلے لمحہ عمارت کو ڈھا دینے والا ہے تو وہ دوسری باتوں کو مسئلہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر جو شخص بھونچال کو آتے ہوئے دیکھ رہا ہو اس کو بھونچال کے سوا کوئی اور بات یاد نہیں رہے گی۔ حتی کہ وہ ادبی تقاضے کے مطابق شاید یہ جملہ کہنا بھی بھول جائے کہ لوگو، بھونچال آرہا ہے، تم لوگ اپنے آپ کو بھونچال سے بچاؤ۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف یہ پکارتا ہوا بھاگے گا کہ ——— بھونچال، بھونچال۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی وہ ہے جس کو پردہ کے اس پار سے جنت کی خوشبو آرہی ہو اور وہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسا شخص یقینی طور پر صرف آخرت کی باتیں کرے گا۔ دوسری چیزیں اس کے ذہن سے اس طرح نکل جائیں گی۔ جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

عجیب کرشمہ

انسان کا جسم چند مادی چیزوں سے مل کر بنا ہے۔ پانی، کاربن، آکسیجن اور کچھ مزید کیمیائی عناصر۔ ظاہری تجزیہ کے اعتبار سے انسان بس اسی قسم کی چند چیزوں کا مجموعہ ہے۔ رابرٹ پیٹسن (R. Pattison) نے انسانی جسم کے ان مادی عناصر کا حساب لگایا تو اس نے پایا کہ بازار کی شرح کے لحاظ سے ان کی کل قیمت ساڑھے چھ ڈالر ہے۔ یعنی ہندستانی سکہ میں تقریباً ستر روپیہ۔

مگر اسی "ستر روپیہ" کے سامان سے اللہ تعالیٰ نے ایسا انمول آدمی بنایا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ سکہ میں اس کی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ستر کھرب روپے بھی ایک انسان کی قیمت نہیں ہو سکتے۔

انسان کے انتہائی قیمتی ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا کوئی عضو اس سے چھن جائے۔ انسان کا ایک ہاتھ کٹ کر اس سے جدا ہو جائے تو اربوں ڈالر ادا کر کے بھی دوبارہ ویسا ہاتھ اس کو نہیں مل سکتا۔ انسان کی آنکھ اگر بے نور ہو جائے تو ساری دنیا کی دولت بھی اس کو وہ آنکھ نہیں دے سکتی جس سے وہ دوبارہ دیکھنے لگے۔ انسان کی زبان اگر جاتی رہے تو کوئی بھی قیمت ادا کر کے وہ بازار سے ایسی چیز نہیں پا سکتا جس سے وہ بولے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔

کیسی عجیب ہے خدا کی کاریگری کہ وہ بے قیمت چیزوں سے انتہائی قیمتی چیز بناتا ہے۔ وہ مردہ چیز کو زندہ چیز میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ بے شعور مادہ سے باشعور مخلوق وجود میں لاتا ہے۔ وہ نہیں سے ہے کی تخلیق کرتا ہے۔

کسی جادوگر کی چھڑی سے ایک پتھر کوئی آواز نکالے تو اس کو دیکھ کر سارے لوگ حیران رہ جائیں گے۔ مگر خدا بے شمار انسانوں کو مادہ سے بنا بنا کر کھڑا کر رہا ہے۔ اور وہ نہایت بامعنی الفاظ میں کلام کر رہے ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر کسی پر حیرانی طاری نہیں ہوتی۔ کیسے اندھے ہیں وہ لوگ جن کو جادوگر کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں مگر خدا کے کرشمے دکھائی نہیں دیتے۔ کیسے بے عقل ہیں وہ لوگ جو جھوٹے کرشمے دکھانے والوں کے سامنے سراپا عقیدت مند بن جاتے ہیں مگر جو ہستی سچے کرشمے دکھا رہی ہے اس کے لئے ان کے اندر عقیدت و محبت کا جذبہ نہیں امنڈتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر خدا کو پالے تو وہ اس کے کمالات میں گم ہو جائے۔ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کا اس کو ہوش نہ رہے۔

کائنات کی شاہراہ

انسان ایک کامل دنیا کے اندر غیر کامل وجود ہے۔ ستارے اور سیارے، ہوا اور پانی، درخت اور جانور سب ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ وہ فطرت کی مقرر شاہراہ سے نہیں ہٹتے۔ اس کے برعکس انسان فطرت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان ویسا بنتا ہے جیسا اسے نہیں بننا چاہئے۔ انسان وہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے۔

انسان کا یہ تضاد سوال بھی ہے اور اسی کے اندر اس کا جواب بھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے تمام مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے۔ اور اس کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ کو دوبارہ اختیار کرلے۔

فطرت کی جو شاہراہ بقیہ چیزوں کے لئے اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ان کو ایک معیاری دنیا میں ڈھال دے، وہی شاہراہ یقینی طور پر اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کو معیاری معاشرہ میں تبدیل کرسکے۔

ہماری غیر معیاری دنیا کے باہر جب ایک وسیع تر معیاری دنیا موجود ہے تو یقینی طور پر ہمارے لئے پہلا صحیح ترین انتخاب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اس دنیا کو سمجھیں اور اس کے اصولوں کو اپنی زندگی پر منطبق کریں۔

کائنات کے مطالعہ سے جو واضح ترین بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ پوری مادی کائنات ایک متعین قانون فطرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مالیکیول سے پانی بننے کا جو اصول ہے وہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ مختلف عناصر کے امتزاج سے کیمیائی مرکبات ہمیشہ ایک ہی لگے بندھے اصول کے تحت بنتے ہیں۔ معدنیات کا پگھلنا اور پانی کا بھاپ بننا ہمیشہ ایک ہی معلوم قانون فطرت کے مطابق وقوع میں آتے ہیں۔ یہی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کے کردار کو اس حد تک معلوم اور متعین ہونا چاہئے کہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکے۔ انسان کا کردار قابل پیشین گوئی کردار ہونا چاہئے، نہ یہ کہ خواہشات کے تحت وہ کبھی ایک قسم کے کردار کا مظاہرہ کرے اور کبھی دوسرے قسم کے کردار کا ——— اخلاقیات کا ایک ہی صحیح معیار ہے، انسان کے لئے بھی اور بقیہ کائنات کے لئے بھی۔

خدا کا وجود

ممتاز ریاضی داں سر مائیکل فرانسس اتیا حال میں بمبئی آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ خدا ایک ریاضی داں ہے۔ خدا کو ریاضی داں قرار دینے کا نظریہ نیا نہیں ہے۔ تقریباً ۵۰ سال پہلے سر جیمس جینس نے کہا تھا کہ کائنات ایک ریاضی داں کا عمل ہے۔ اس سے بھی صدیوں پہلے فیثا غورث نے کہا تھا کہ تمام چیزیں دراصل گنتیاں ہیں۔ پکاسو کے نزدیک خدا ایک آرٹسٹ ہے۔ اس نے کہا کہ خدا فی الواقع دوسرا آرٹسٹ ہے۔ اس نے زرافہ ایجاد کیا۔ اس نے ہاتھی بنایا۔ اس نے بلی بنائی۔ آئن سٹائن نے کہا تھا کہ خدا لطیف ہے اور اگرچہ وہ کسی کو برا چاہنے والا نہیں مگر وہ بہت ہوشیار ہے:

The distinguished mathematician, Sir Michael Francis Atiyah, who was recently in Bombay said that "God was a mathematician." The idea of God being a mathematician is not new. About 50 years ago, Sir James Jeans suggested that the universe was the handiwork of a mathematician. And centuries before him Pythagoras said all things are numbers. To Picasso God was an artist. "God is really another artist," he said. "He invented the giraffe, the elephant and the cat." Einstein has said that the Lord is subtle and, though not malicious, very clever.

جو شخص بھی کائنات کو زیادہ گہری نظر سے دیکھتا ہے اس کو ایک چیز کا یقینی احساس ہوتا ہے — یہاں کوئی اور ہے جو سب سے بڑا ہے اور خود اس کی اپنی ذات سے بھی۔ ریاضی داں کو کائنات میں ایسی اونچی ریاضی نظر آتی ہے جہاں اس کو اپنی ریاضی بھول جاتی ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدا بہت بڑا ریاضی داں ہے۔ ایک آرٹسٹ جب کائنات کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو یہاں اس کو اتنا اعلیٰ آرٹ نظر آتا ہے کہ اس کا اپنا آرٹ اس کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدا سب سے بڑا آرٹسٹ ہے۔ ایک عقل والا آدمی جب کائنات کی حکمتوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں کوئی اور ہے جو تمام عقلوں سے زیادہ بڑی عقل والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سب سے بڑا ریاضی داں، سب سے بڑا آرٹسٹ، سب سے بڑا عاقل ہے اور اسی کے ساتھ وہ مزید بہت کچھ ہے۔ جو شخص کائنات میں خدا کے نشان کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے اور جو شخص دیکھ کر بھی اس کو نہ مانے وہ مجنون ہے۔

مستقبل کا یقین

ڈارلنگٹن ہال (Darlington Hall) انگلینڈ کا ایک ممتاز اسکول ہے۔ وہاں ایک طالب علم کو سالانہ پانچ ہزار پونڈ تعلیمی فیس دینی پڑتی ہے۔ اس کے پرنسپل بلیکشا (Dr. Lyn Blackshaw) نے ۱۱ جولائی ۱۹۸۴ کو اسکول اسٹاف کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں طلبہ کو اپنی ڈگری بے قیمت معلوم ہونے لگی ہے۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے حصول کے بعد اپنی پسند کے مطابق کوئی روزگار حاصل کرلیں گے۔ اس بے یقینی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اندر جھنجھلاہٹ کی نفسیات پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ کثرت سے جرائم کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ:

The worst thing we can do for our children
is to destroy their faith in the future.

سب سے بری چیز جو ہم اپنے بچوں کے لئے کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ مستقبل کے بارہ میں ان کے یقین کو برباد کردیں (سنڈے ٹائمس، لندن، ۲ ستمبر ۱۹۸۴)

پرنسپل کے اس جملہ پر ہم یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے بعد روزگار حاصل کرنے کا مسئلہ انسان کے "مستقبل" کا صرف ایک چھوٹا سا جزء ہے۔ مستقبل کا مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے موجودہ مرحلہ سے لے کر موت کے بعد کی ابدی زندگی تک چلا گیا ہے۔

انسان کو کامل اطمینان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کو اس کے پورے مستقبل کے بارہ میں پر امید نقطۂ نظر مل جائے۔ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے جتنے غالب افکار ہیں سب نے موت کے بعد ابدی مستقبل کے بارہ میں انسان کے یقین کو برباد کر دیا ہے۔ یہی جدید انسان کے عدم اطمینان کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ ہے۔

انسان کو جب تک ایک ایسا کامل نقطۂ نظر نہ دیا جائے جو اس کے حال اور مستقبل کو ابدی طور پر پر امید بناتا ہو، وہ کبھی حقیقی معنوں میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک نوجوان کو اپنے دنیوی مستقبل کا مسئلہ پریشان کرتا ہے مگر جب وہ اپنا دنیوی مستقبل تعمیر کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ اب دوسرے سوالات اس کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پریشانیوں سے آدمی اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب کہ وہ ابدی عمر تک کے لئے اپنے سوالات کا جواب پالے نہ کہ صرف وقتی عمر تک کے لئے۔

خدا سے بغاوت

خدا نے اپنی دنیا کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کے مطابق وہ اپنی دنیا کو چلا رہا ہے۔ جو لوگ اس منصوبہ سے مطابقت کرکے اس دنیا میں رہیں وہ خدا کے فرماں بردار بندے ہیں۔ خدا ان کو اپنے ابدی انعامات سے نوازے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس منصوبہ سے مطابقت نہ کریں وہ خدا کی دنیا میں فساد پھیلانے کے مجرم ہیں۔ خدا انھیں عنقریب پکڑ لے گا اور ان کو ایسی سزا دے گا جس سے ابد تک نکلنا ان کے لئے ممکن نہ ہو۔

خدا ہر صبح سورج کو روشن کرتا ہے تاکہ اس کے بندے اس کی روشنی میں چلیں۔ مگر ایک انسان دوسرے انسان کو اندھیرے میں دھکیل دینا چاہتا ہے۔ خدا زمین سے رزق اگاتا ہے تاکہ اس کے بندے اس سے اپنی بھوک مٹائیں۔ مگر ایک انسان دوسرے انسان کو بھوک سے تڑپا کر خوش ہوتا ہے۔ خدا اپنے پاس سے بارش برساتا ہے تاکہ تمام انسان اور جاندار اس سے سیراب ہوں۔ مگر انسان اپنے مفروضہ دشمنوں کو پیاس سے تڑپا کر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے۔

خدا لوگوں کے لئے مواقع کھولتا ہے تاکہ وہ ان مواقع کا استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ مگر انسان یہ منصوبہ بناتا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کے ملے ہوئے مواقع کو چھین لے۔ خدا ایک انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ مگر دوسرا انسان حسد میں مبتلا ہو کر چاہتا ہے کہ اس کو بے عزت کرے اور اس کو ناکام بنا کر چھوڑ دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ یعنی خدا نے اپنی دنیا کا نقشہ جس ڈھنگ سے بنایا ہے اس میں بگاڑ پیدا کرنا۔ خدا کی دنیا میں خدا کے منصوبہ کے خلاف زندگی گزارنا۔ خدا کی زمین میں خدا کی پسند کو چھوڑ کر وہ روش اختیار کرنا جو آدمی کی پسند اور خواہش کے مطابق ہو۔

انسان خدا کی اسکیم کی نفی کرتا ہے۔ انسان خدا کے فیصلہ کو بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ سب سے بڑا جرم ہے جو کوئی انسان اس زمین پر کر سکتا ہے۔ آج یہ سب سے بڑا جرم خدا کی زمین پر سب سے بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بغاوت کے مرتکب وہ لوگ بھی ہیں جو خدا کی بغاوت کو خدا کی زمین سے ختم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

کائناتی مشین

۱۹۶۵ کی جنگ میں پاکستان کے پاس زیادہ بہتر ہتھیار تھے۔ ہندستان کے وجینت ٹینک کے مقابلہ میں پاکستان کا برطانی پیٹن ٹینک زیادہ اعلیٰ تھا۔ ہندستان کے نیٹ جہازوں کے مقابلہ میں پاکستان کے فرانسیسی سیبر جیٹ زیادہ طاقت کے ساتھ مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر بھی ہندستان کو جیت ہوئی اور پاکستان ہار گیا۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے۔ وہ ان کو استعمال کرنے کی مکمل مہارت رکھتا تھا جب کہ پاکستان کے ہتھیار بیرونی ملکوں کے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ پاکستانی سپاہی ان کو مہارت کے ساتھ استعمال نہ کر سکے اور ہار گئے۔ ایک جنگی تبصرہ نگار نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> Even the most sophisticated technology of warfare is handled ultimately by men engaged in the profession of soldiering. Its use in combat depends therefore greatly on their skill, training, morale and ingenuity. The doctrine of the supremacy of the man behind the gun thus remains valid even in this age of push-button wars.

جنگ کی انتہائی پیچیدہ مشینری بھی آخر کار متعلقہ فوجی آدمیوں ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔ اس لئے جنگ میں ان کا استعمال بہت بڑی حد تک ان کی مہارت، تربیت، جرأت اور تدبیر پر منحصر ہوتا ہے۔ قدیم اصول کے مطابق بندوق کا استعمال کرنے والے آدمی کی اہمیت آج بھی بدستور باقی ہے، حتیٰ کہ اس بٹن دبانے والے دور میں بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲ فروری ۱۹۸۴ء)

مذکورہ قسم کے واقعات کائنات کی مشینی تعبیر کی تردید ہیں۔ ہماری مشینوں کو چلانے کے لئے ہمیشہ ایک ''انسان'' درکار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی عظیم مشین کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے۔ اس قیاس کے لئے کوئی نظیر موجود نہیں۔ کائنات ایک سائنس داں کے الفاظ میں بالفرض ایک ''گریٹ مشین'' ہو تب بھی اس کو چلانے کے لئے ایک ''گریٹ مائنڈ'' چاہئے۔ انسان مجبور ہے کہ خدا کو مانے، خواہ مذہبی زبان میں خالق و مالک کی حیثیت سے یا سائنسی الفاظ میں مشین کو چلانے والے انجینئر کی حیثیت سے

جمہوریت کی قیمت

اسرائیل کا ایک دلچسپ واقعہ نظر سے گزرا۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے:

Worn out after an interminable meeting, a Tel Aviv company director said with a sigh, "If the children of Israel had been led by a committee instead of by Moses, they'd still be in Egypt."

تل ابیب کی ایک کمپنی کا ڈائرکٹر لا متناہی میٹنگوں سے سخت اکتا چکا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ اگر بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت موسیٰ کے بجائے ایک کمیٹی کر رہی ہوتی تو بنی اسرائیل ابھی تک مصر ہی میں ہوتے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۴)

مجلس اور کمیٹی کی بحثوں کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں کس قدر بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں۔ لفظی نکتے، دور از کار امکانات، غیر اہم پیش بندیوں پر لوگ اس قدر بحثیں کرتے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ راقم الحروف اس دنیا میں جن چیزوں سے پناہ مانگتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اس کو کبھی کسی مجلس یا کمیٹی کا ممبر نہ بنائے۔

کوئی بڑا کام اجتماعی کوشش سے ہوتا ہے۔ اور اجتماعی کوشش میں ہمیشہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صورت کیا ہو۔ اختلاف رائے کو اتحاد عمل کے ساتھ کس طرح مطابق کیا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک شخصی اعتماد، اور دوسری جمہوریت۔ اول الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے ہیں مگر بالآخر مرکزی قائد کی رائے کو تمام لوگ بلا بحث مان لیتے ہیں۔ ثانی الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ جو معاملہ پیش آتا ہے اس پر ہر شخص کی الگ الگ رائے لی جاتی ہے اور جس طرف رایوں کی کثرت ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر ثانی الذکر طریقہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں کام کم ہوتا ہے اور بحث مباحثہ زیادہ۔ اسلام میں درمیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ابتدائی مرکزی قائد کو منتخب کرنے میں عوامی رائے کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے مگر جب عوامی رائے سے ایک امیر کا انتخاب ہو جائے تو اس کو اسی طرح مکمل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جیسے موجودہ زمانہ میں امریکہ کے صدر کو۔

انسان کی تلاش

فلپ جان بائر (Philip John Bayer) امریکہ کا ایک بڑا تاجر تھا۔ وہ کویکر اسٹیٹ ریفائننگ کمپنی (Quaker State Refining Co.) کا بانی تھا۔ اس کے یہاں صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکا مرا تو اس نے بھی صرف ایک لڑکی چھوڑی جس کا نام الینر رٹشی (Eleanor Ritchey) تھا۔

الینر رٹشی کے پاس بے پناہ دولت تھی مگر وہ انسانوں سے اس قدر متنفر تھی کہ اس نے شادی نہیں کی اور تمام عمر اکیلی رہی۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ کو اس کا انتقال ہوا تو اس کی عمر ۵۸ سال تھی۔ انسانوں سے بے رغبت ہو کر اس نے اپنی دل چسپی کے لئے عجیب و غریب عادتیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً وہ کثرت سے جوتے خریدتی۔ مگر ہر جوتے کو وہ صرف ایک بار پہنتی تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں ۱۷۰۰ جوڑے جوتے موجود تھے۔ اسی طرح اس کے گھر میں اسٹیشنری کے ۲۲۴۱ بکس پائے گئے۔ وغیرہ

اس کی سب سے عجیب دل چسپی کتے تھے۔ وہ جب اپنی کار سے باہر نکلتی اور کوئی آوارہ کتا اس کو نظر آتا تو وہ پکڑوا کر اس کو اپنے گھر لاتی اور ان کو خصوصی اہتمام سے پالتی۔ اس طرح اس کے یہاں ۱۵۰ کتے جمع ہو گئے۔ اس کا گھر کتوں کی اس فوج کے لئے ناکافی معلوم ہوا تو اس نے اولاً بارہ ایکڑ اور اس کے بعد ۱۸۰ ایکڑ زمین صرف اس لئے خریدی کہ وہاں کتوں کو خصوصی اہتمام کے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا جاسکے۔

الینر رٹشی نے اپنی موت سے پہلے ایک وصیت نامہ تیار کرایا۔ اس وصیت میں اس نے لکھا کہ میری دولت میرے پالتو کتوں کے لئے وقف ہے۔ جب ایک ایک کرکے تمام کتے مر جائیں تو میری پوری دولت الباما (امریکہ) کے مدرسہ حیوانات (School of Veterinary Science) کو دے دی جائے۔

اب اس کے کتوں میں صرف آخری کتا رہ گیا ہے جس کا نام مسکٹیر (Musketeer) ہے۔ یہ تیرہ سالہ کتا اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا پاؤں کانپتا ہے اور جب وہ چھینکتا ہے تو زمین میں گر پڑتا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت جلد مر جائے گا اس کے بعد مذکورہ مدرسہ حیوانات کو بارہ ملین ڈالر کی رقم اچانک حاصل ہو جائے گی (ٹائمس آف انڈیا ۲ جنوری ۱۹۸۴)

آدمی کو اگر آئیڈیل انسان نہ ملے تو اس کو آئیڈیل نظریہ تلاش کرنا چاہئے۔ الینر رٹشی اگر ایسا نظریہ پالیتی تو انسان اس کے لئے محبت کا موضوع بن جاتا نہ کہ بحث کا موضوع۔

حج کا پیغام

کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو اس میں تردد تھا کہ اسلامی عبادتوں میں کون سی عبادت افضل عبادت ہے۔ جب انھوں نے حج ادا کیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہوگیا کہ حج تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔

حج کی اس فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج کا تعلق ایک عظیم خدائی منصوبہ سے ہے۔ حج ایک ایسے خدائی منصوبہ کی یادگار ہے جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی آخری تکمیل ہوئی۔

حج کے مختلف مناسک اسی خدائی منصوبہ کے مختلف مراحل ہیں جن کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے۔ حاجی اپنے گھر سے نکل کر حجاز کے لئے روانہ ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر حجاز آئے۔ وہ مکہ کے قریب پہنچ کر سلے ہوئے کپڑے اتار دیتا ہے اور اپنے جسم پر دو چادریں لپیٹ لیتا ہے۔ یہ اسی قسم کی سادہ پوشاک ہے جو اس زمانہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ہوتی تھی۔ حاجی مکہ پہنچتا ہے تو کعبہ کے گرد گھوم کر اس کا چکر لگاتا ہے۔ یہ وہی طواف ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے عہد خداوندی کی توثیق کے لئے کیا تھا۔ حاجی صفا و مروہ کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ حضرت ہاجرہ کی اس دوڑ کی نقل ہے جو انھوں نے اس بیابان میں پانی کی تلاش کے لئے کی۔ حاجی منیٰ جا کر قربانی کرتا ہے، یہ اس قربانی کا علامتی اعادہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اولاً بیٹے کے لئے اور اس کے بعد خدا کے حکم سے مینڈھے کے لئے کی تھی۔ حاجی جمرات پر جا کر شیطان کو کنکریاں مارتا ہے۔ یہ اس عمل کی یادگار ہے جو حضرت اسماعیل نے شیطان کی طرف کنکریاں مار کر کیا تھا۔ جب کہ اس نے انھیں بہکانے کی کوشش کی۔ پھر تمام حاجی عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس عمل کی آخری صورت ہے جو لبیک اللھم لبیک کی صورت میں ہر حاجی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں تمام حاجی کھلے میدان میں جمع ہو کر اپنے خدا سے اجتماعی عہد کرتے ہیں کہ وہ وہی کریں گے جس کا سبق انھیں حج کی صورت میں دیا گیا ہے۔ وہ اسی میں جئیں گے جس میں وہ لوگ جیے جن کی یادگار میں حج کی عبادت ادا کی جاتی ہے۔

حج کے مناسک کو قرآن میں شعائر کہا گیا ہے یعنی علامتی چیزیں۔ یہ سب دراصل حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزرنے والے واقعات ہیں جو مذکورہ منصوبہ الٰہی کی تکمیل کے دوران پیش

ناتمام کہانی

مسٹر پی - این - پاٹھک ایک بے حد محنتی آدمی تھے ۔ وہ انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) میں ایک معمولی ملازم کے طور پر ۱۹۵۸ میں داخل ہوئے اور آخر میں اس کے کمپوزنگ شعبہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بن گئے ۔ وہ غالباً مزید ترقی کرتے مگر ۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ کو حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا ۔ مرنے کے وقت ان کی عمر صرف ۵۰ سال تھی ۔

ہندستان ٹائمس (۲۸ دسمبر ۱۹۸۴) میں ان کی اچانک موت کی خبر دیتے ہوئے یہ الفاظ درج ہیں کہ وہ اپنے موجودہ عہدہ پر محض سخت محنت کے ذریعہ پہنچے تھے :

He rose to the present position by sheer hard work

مسٹر پاٹھک نے الٰہ آباد میں تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد چند سال تک وہ ٹائمس آف انڈیا اور انڈین اکسپریس میں رہے ۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ میں وہ ہندستان ٹائمس کے عملہ میں داخل ہوئے ۔ یہاں انھیں جم کر کام کرنے اور محنت کرنے کا موقع ملا ۔ ۲۵ سال محنت کے بعد وہ اخبار میں ایک بڑے عہدہ پر پہنچ گئے ۔ مگر ابھی وہ اس عہدہ سے متمتع بھی نہیں ہو سکے تھے کہ اچانک موت کا وقت آگیا ۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کیسے عجیب المیہ سے دوچار ہے ۔ انسان بے پناہ محنت کرتا ہے ۔ وہ اپنی پوری طاقت خرچ کر کے ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے ۔ مگر اپنی کوششوں کے آخری انجام سے فائدہ اٹھانے کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوتا کہ اس کی موت آجاتی ہے ۔

زندگی کا یہ خاتمہ کیسا دردناک ہے ۔ مگر کوئی شخص اس پر غور نہیں کرتا ۔ ہر آدمی دوبارہ اسی دردناک کہانی کو لکھنا چاہتا ہے جس کو اس کے پیشرو نے لکھنا چاہا تھا اور وہ اس کو لکھنے میں کامیاب نہ ہوا ۔ تمام انسانوں کی کہانی نامکمل کہانی ہے ۔ مگر کوئی نہیں جس کو یہ سوال بے چین کرے کہ اس کا راز کیا ہے اور وہ کون سا طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے انسان کی کہانی مکمل کہانی بن سکے ۔

ہر انسان اس دنیا میں ایک ناتمام کہانی ہے ۔ ہر انسان اپنی منزل پر پہنچ کر اچانک بے منزل ہو جاتا ہے ۔ زندگی کی یہ بے انجامی کیسی عجیب ہے ۔ اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ کسی کو اپنی بے انجامی کی فکر نہیں ۔

مقبولیت کا راز

بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) اپنے بچپن میں (Tactless) مشہور تھا۔ مگر بعد کو اس نے اتنا مقام پیدا کیا کہ وہ امریکہ کی طرف سے فرانس میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ صرف یہ کہ تجربات سے اس نے جانا کہ لوگ اپنے خلاف تنقید سے بہت برہم ہوتے ہیں۔ اس نے طے کیا کہ میں کبھی کسی کی کوئی خرابی نہیں بیان کروں گا۔ میں ہر ایک کی صرف خوبیاں بیان کروں گا:

I will speak ill of no man, and speak
all the good I know of everybody.

یہی وجہ ہے کہ بااصول آدمی ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض ہوتا ہے اور بے اصول آدمی کو لوگوں کی نظر میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ بااصول آدمی ہمیشہ حق کہتا ہے، خواہ وہ کسی کے موافق ہو یا کسی کے خلاف۔ جب کہ بے اصول آدمی ہر موقع کے لحاظ سے وہ بات کہتا ہے جس کو سن کر لوگ خوش ہو جائیں۔ سب کی پسند کی بات کہنے کی اسے یہ قیمت ملتی ہے کہ وہ سب کی نظر میں پسندیدہ شخص بن جاتا ہے۔

یہ طریقہ تاجر کے لئے یقیناً مفید ہے مگر وہ داعی اور مصلح کے لئے زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح بولنے والے کے اندر وہ کردار ابھرتا ہے جس کو شریعت کی زبان میں منافق کہا گیا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اندر سے کچھ ہوتا ہے اور باہر سے کچھ۔ وہ دل میں ایک چیز کو حق سمجھتا ہے اور زبان سے اس کے خلاف بولتا ہے۔ اس کی عقل اس کو ایک طریقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے مگر محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کی خاطر وہ لوگوں کے سامنے دوسرے طریقہ کی وکالت کرتا ہے۔ اس کی آنکھ اس کو جو چیز اندھیرے کی صورت میں دکھاتی ہے اس کو وہ اپنی زبان سے اجالا بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسا انسان باعتبار حقیقت ایک مردہ انسان ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ زندہ اور خوش پوش دکھائی دیتا ہو۔

داعی خدا کا سفیر ہوتا ہے۔ مگر دنیوی حکومتوں کے سفیر میں اور خدا کے سفیر میں بہت بڑا فرق ہے دنیوی حکومت کا سفیر وہ بات کہنے کے لئے بھیجا جاتا ہے جس سے لوگ خوش ہوں۔ مگر خدا کا سفیر لوگوں کے سامنے اس لئے آتا ہے کہ انھیں وہ بات بتائے جس سے خدا خوش ہوتا ہے۔ ایک مصلحت کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔ دوسرا حق کے تقاضے کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو جائے۔

ناکام موت

مسٹر بی ڈی کھوبرا گاڑے ۹ اپریل ۱۹۸۴ کو دہلی کے پنت اسپتال میں مر گئے۔ وہ ایک ہریجن لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ اونچی ذات والوں کے امتیازی سلوک کو دیکھا۔ ان کے اندر اس کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس امتیاز کی بنیاد خود اس ہندستانی مذہب میں ہے جس سے وہ اب تک اپنے کو منسوب سمجھے ہوئے تھے تو انھوں نے مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر اور لاکھوں دوسرے ہریجنوں کے ساتھ وہ بدھ مذہب میں داخل ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود ہریجنوں کے ساتھ سماجی امتیاز ختم نہیں ہوا۔

اب کھوبرا گاڑے اور ان کے ساتھیوں نے دوسری تدبیر کی۔ انھوں نے ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ انھوں نے چاہا کہ جو مسئلہ تبدیلی مذہب سے حل نہیں ہوا اس کو تبدیلی حکومت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر یہ اقدام بھی کامیاب نہیں ہوا۔ خود ری پبلکن پارٹی میں اندرونی اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ مایوس کھوبرا گاڑے ۵۹ سال کی عمر میں اس دنیا سے چلے گئے۔

مسٹر کھوبرا گاڑے اپنی اس زندگی کے مسئلہ کا حل تلاش کرتے رہے جو "۵۹ سال" میں ختم ہو جانے والی تھی۔ آج اگر کوئی شخص ان سے پوچھے تو یقیناً وہ کہیں گے ____ افسوس کہ میں وقتی زندگی کے مسائل میں الجھا رہا اور اپنی اس زندگی کے لئے کچھ نہیں کیا جس سے ابدی سابقہ پیش آنے والا تھا۔

لوگ آج کے مسائل میں اتنا مشغول ہیں کہ انھیں کل کے مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ حال کے اندر اتنا گم ہیں کہ ان کو یہ پروا نہیں کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچیں۔ لوگ اسی طرح غفلت میں پڑے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی موت آ جاتی ہے۔ انسانوں میں الجھا ہوا آدمی اچانک اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے۔ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھنے والا آدمی وہاں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں صرف آخرت کے مسائل کسی آدمی کے لئے سب کچھ ہوں گے۔ ظواہر کو اہمیت دینے والا آدمی اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں حقیقت کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

انسان کو دیکھئے تو وہ کتنا حیرت انگیز وجود معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی صلاحیتیں اتنی عجیب ہیں کہ ساری کائنات میں اس سے زیادہ عجیب کوئی چیز نہیں۔ مگر کیسا دردناک انجام انسان کے حصہ میں آیا ہے۔ کیسی قیمتی زندگی کیسے بے قیمت انجام پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس کو سوچے، کوئی نہیں جو زندگی کو حقیقی بنانے کے لئے فکرمند ہو۔

داعی کون

داعی پیغمبر نہیں ہوتا مگر وہ خدا کا پیغام دینے والا ہوتا ہے۔ اس کو وہ بات کہنی پڑتی ہے جو خدا کی بات ہے۔ اس کو وہ حق پیش کرنا ہوتا ہے جس میں غیر حق کی کوئی ملاوٹ شامل نہ ہو۔ دعوت خدا کے بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے اور خدا کی نمائندگی کبھی مصلحت اور ملاوٹ کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

ریڈیو سٹ ایک ایسا آلہ ہے جو بکھری ہوئی خاموش نشریات کو قابل سماعت آواز کا روپ دیتا ہے۔ وہ فضا کی غیر مرئی لہروں کو الفاظ میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ ایک مادی مثال ہے جس سے حق کے داعی کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جو کام ریڈیو سٹ کرتا ہے وہی داعی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنا کام بے روح مشین کی صورت میں انجام دیتا ہے اور داعی زندہ انسان کی صورت میں۔

داعی وہ شخص بنتا ہے جس کے اوپر قرآن کے معانی اس طرح کھلیں جیسے کہ قرآن اس کے اوپر ازسرنو اتر رہا ہے۔ داعی وہ شخص ہے جس کے لئے کائنات جبریل امین کی قائم مقام بن جائے۔ وہ خدا کی دنیا میں اسی طرح خدا کا پیغام اخذ کرنے لگے جس طرح ریڈیو سٹ نشر گاہ کے پیغام کو اخذ کرتا ہے۔ سائنس داں کائنات میں قانون فطرت کو پڑھتا ہے، داعی وہ ہے جو کائنات میں قانون ربانی کو پڑھنے لگے۔

دعوت خدا کے کلام کو انسانی کلام میں ڈھالنا ہے۔ دعوت خدا کی اس تسبیح کو الفاظ کا روپ دینا ہے جو کائنات میں خاموش صورت میں بیان ہو رہی ہے۔ دعوت وہی دعوت ہے جس میں حق کو بالکل برہنہ صورت میں دکھا دیا جائے۔ مگر حق کو برہنہ کرنے کے لئے داعی کو خود بھی "نذیر عریاں" بن جانا پڑتا ہے۔ داعی بننا ہمیشہ اپنی ہلاکت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور میں آتا ہے اسی کا نام داعی ہوتا ہے۔ داعی انسان کے روپ میں غیر انسان ہوتا ہے۔ داعی لوگوں کے درمیان رہ کر اپنے آپ کو لوگوں سے جدا کرتا ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کا داعی بنے۔

داعی بننے کے لئے اپنے آپ کو حذف کرنا پڑتا ہے۔ دین کو اپنا فخر بنانے کے بجائے دین کو اپنا درد بنانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی کسی کو داعی کا مقام ملتا ہے۔ دوسرے انسانوں کو اس دین سے دلچسپی ہو سکتی ہے جو آپ کا درد ہو۔ ان کو اس دین سے دلچسپی نہیں ہو سکتی جو آپ کا فخر ہو۔ دعوت اور فخر دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

خوراک

والٹرڈی لا میر (Walter De La'Mare) ایک انگریز شاعر ہے۔ وہ ۱۸۷۳ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے انسان کے بارہ میں ایک طنزیہ نظم کہی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

It is a very odd thing
As odd as can be
That whatever Miss T eats
Turns into Miss T

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے، اتنی عجیب جتنی کہ کوئی چیز عجیب ہو سکتی ہے۔ مس ٹی جو کچھ بھی کھاتی ہے وہ سب مس ٹی بن جاتا ہے۔

ہر آدمی کی اپنی ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا رنگ، اس کے بدن کی ساخت، اس کے بولنے کی زبان، اس کا طرز فکر، سب اس حد تک دوسروں سے مختلف ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں پہچانا جاسکے۔ آدمی روزانہ طرح طرح کی چیزیں کھاتا ہے۔ مگر وہ جو کچھ کھاتا ہے وہ اس کے اندر جاکر اس کی اپنی شخصیت میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی کھانے کی چیز باہر خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ آدمی کے اندر داخل ہونے کے بعد وہی بن جاتی ہے جو وہ خود ہوتا ہے۔ ہر آدمی جو خوراک کھاتا ہے یا جو پانی وہ اپنے جسم میں داخل کرتا ہے اس کو وہ تحلیل کرکے اپنے وجود کا حصہ بنا لیتا ہے۔

یہی معاملہ خیالات و نظریات کا بھی ہے۔ آدمی بہت کم ایسا کرتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھے یا سنے اس کو اس طرح دیکھے یا سنے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ اکثر وہ چیزوں کو اس شکل میں دیکھتا ہے جیسا کہ وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر بات جو آدمی کے اندر داخل ہوتی ہے وہ اس کے اپنے ذوق کے مطابق بدل کر اس کی فکر کا جز بن جاتی ہے۔

اسی مثال میں مومن اور غیر مومن کا فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ دنیا طرح طرح کے واقعات و حقائق سے بھری ہوئی ہے۔ یہ واقعات و حقائق مومن کے سامنے بھی آتے ہیں اور غیر مومن کے سامنے بھی۔ مگر دونوں انھیں اپنے اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کے لئے وہ اس کے ایمان کی غذا بن جاتے ہیں۔ مگر دوسرے کو ان سے اس کے سوا کچھ اور نہیں ملتا کہ اس کی سرکشی اور گمراہی میں اضافہ ہو جائے

قومی ہیرو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات کے دفتر میں بی ایس سی کا ایک مسلمان طالب علم داخل ہوا "یہ مسلم یونیورسٹی ہے"۔ اس نے پرجوش انداز میں کہنا شروع کیا: "یہاں آپ دینی امور کے ذمہ دار ہیں۔ میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ یہاں کی آزاد لائبریری میں انگریزی کی ایک کتاب ہے جس میں ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر ہے۔ آپ اس کتاب کو فوراً لائبریری سے ہٹوا دیں ورنہ ... "

ناظم دینیات نے کہا "تم جانتے ہو کہ آزاد لائبریری بہت بڑی لائبریری ہے۔ یہاں دنیا کے مختلف اداروں سے کتابیں آتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں ایسی کتابیں بھی آسکتی ہیں جن میں اللہ میاں کا مذاق اڑایا گیا ہو۔ کیا تم ایسی سب کتابوں کو دیکھ کر مشتعل ہوتے رہو گے"

"سر اللہ میاں تو سب کے یہاں اور رسول اللہ تو ہمارے ہیں" (احتساب علی گڑھ ۵ مئی ۱۹۸۴)

مسلمان طالب علم کو کیوں خدا سب کا نظر آیا اور رسول صرف اپنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رسول کو اپنا قومی ہیرو سمجھ لیا۔ ہر قوم کا اپنا الگ ایک ہیرو ہوتا ہے جس پر وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں فخر کرتی ہے۔ خدا میں اشتراک ممکن ہے مگر قومی ہیرو میں اشتراک ممکن نہیں۔ یہی قومی نفسیات تھی جس کی وجہ سے مسلمان طالب علم خدا کے خلاف بات پر نہیں بھڑکا مگر رسول اللہ کے خلاف بات کو دیکھ کر بھڑک اٹھا۔

مذکورہ طالب علم کا واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان کبھی "جشن خداوندی" نہیں مناتے۔ البتہ وہ "جشن محمدی" خوب دھوم کے ساتھ ساری دنیا میں مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنی قومی نفسیات کی بنا پر انھیں خدا میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ خدا میں وہ اپنے لئے ذاتی فخر کا سامان نہیں پاتے۔ البتہ "محمد" تاریخی طور پر چونکہ ان کے ہیرو یا ان کا قومی فخر بن چکے ہیں اس لئے ان کے نام پر خوب دھوم مچاتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے پرفخر قومی جذبات کی تسکین حاصل کر سکیں۔

آج ہر طرف الحاد کا غلبہ ہے مگر مسلمانوں کے اندر یہ جوش نہیں ابھرتا کہ وہ الحاد کے فکری غلبہ کو ختم کر کے توحید کا فکری غلبہ قائم کریں۔ البتہ پیغمبر کی تصویر دیکھ کر وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر ہیرو پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

گروہی اعتراف

یہود تورات کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ اسی طرح عیسائی انجیل کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ مگر جب قرآن ان کے سامنے آیا تو اس کو انھوں نے خدا کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ماننا گروہی ماننا تھا نہ کہ حقیقی ماننا۔ وہ حق کو صرف اپنے گروہ کی بنیاد پر پہچانتے تھے نہ کہ اس کے جوہر کی بنیاد پر۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گروہی حق کو مانا اور گروہ سے باہر جو حق تھا اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وإذا قيل لهم آمنوا بما أنزل الله قالوا نؤمن بما أنزل علينا ويكفرون بما وراءه وهو الحق مصدقا لما معهم (البقرہ ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو (قرآن) بھیجا ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں کہ ہم اس کو مانتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔

یہ نفسیات جس کے تحت یہود و نصاریٰ نے قرآن کا انکار کیا تھا، وہ آج پوری طرح مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کا بھی یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ صرف گروہی صداقت کو جانتے ہیں۔ وہ چیزوں کو اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ان کے گروہ سے باہر اگر کوئی خوبی پائی جاتی ہو تو اس کی انھیں کوئی خبر نہ ہوگی۔

مسلمان آج بے شمار گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اس عالم کو عالم جانتا ہے جو اس کے اپنے گروہ کا ہو۔ باہر کے عالم کی اسے خبر نہیں۔ ہر گروہ اپنے گروہ کے متقی کو متقی سمجھتا ہے۔ باہر کے متقیوں کی اس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ وہی مصنف ——— مصنف ہے جو اپنے حلقہ کا ہو۔ اپنے حلقہ سے باہر کی کسی چیز کو وہ اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے جیسے وہ اس کو دکھائی ہی نہیں دیتی۔

خدا کے یہاں اس انسان کی قیمت ہے جس نے حق کو جوہر کی بنیاد پر پہچانا ہو۔ جو شخص گروہ کی بنیاد پر حق کو پہچاننے کی مہارت دکھاتے اس کی قیمت صرف اس کے اپنے گروہ میں ہے، خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

غلط اقدام

لیما (Lima) جنوبی امریکہ کا ایک شہر ہے۔ یہاں ایک غریب عورت اپنے چار بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مقامی طور پر وہ کوئی اچھا روزگار پانے میں ناکام رہی۔ اس نے سنا تھا کہ شمالی امریکہ (USA) بہت خوش حال ملک ہے۔ اس نے حصول معاش کے لئے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس کے پاس ہوائی جہاز کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو ایک سوٹ کیس میں بند کیا اور اس سوٹ کیس کو کسی نہ کسی طرح لیما سے لاس انجلس جانے والے ہوائی جہاز پر بطور لگیج سوار کرادیا۔

جہاز لاس انجلس پہنچا۔ اس کا سامان حسب معمول نکال کر مخصوص مقام پر لایا گیا جہاں ہر آدمی پہچان کر اپنا سامان لے لیتا ہے۔ مگر ایک سوٹ کیس کا کوئی لینے والا نہیں ملا۔ بالآخر پولس نے اس سوٹ کیس کو کھولا تو اس کے اندر مذکورہ عورت کی لاش بند تھی۔ یو پی آئی کی خبر کا آخری فقرہ یہ تھا:

Detectives said the woman may have been crushed by the weight of other luggage.

تفتیش کرنے والوں نے کہا کہ عورت غالباً دوسرے سامانوں کے بوجھ کے نیچے کچل کر مر گئی۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جنوری ۱۹۸۵)

یہ واقعہ زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ منزل تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کسی نہ کسی طرح ایک اقدام کر ڈالے۔ اقدام کی کامیابی کے لئے بہت سے دوسرے اسباب کی موافقت ضروری ہے۔ یہ دوسرے اسباب اگر موافقت کے لئے موجود ہوں تو اقدام کامیاب ہوگا اور اگر دوسرے اسباب موافقت نہ کریں تو اقدام سراسر ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

مذکورہ واقعہ میں عورت کا اقدام ایک انفرادی اقدام تھا۔ اس غلط اقدام کا نتیجہ اسے انفرادی طور پر بھگتنا پڑا۔ مگر ایک لیڈر جب کسی قوم کو اقدام کی طرف لے جاتا ہے تو یہ ایک اجتماعی اقدام ہوتا ہے اس کا انجام پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ لیڈر کو مذکورہ خاتون کے مقابلہ میں کروروں گنا زیادہ محتاط ہونا چاہئے۔ لیڈر کے لئے غلط اقدام صرف غلط اقدام نہیں بلکہ وہ ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہو سکتا۔

غلط اقدام سے کروروں گنا زیادہ بہتر ہے کہ آدمی کوئی اقدام ہی نہ کرے۔

بے معنی اچھل کود

یو پی کی ایک مسلم خاتون بیوہ ہوگئیں۔ ان کی تین چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا تھا جو باپ کے انتقال کے وقت نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ خاتون نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجنیئر بنائے گی۔ اس نے شوہر کا پراویڈنٹ فنڈ خرچ کرکے اور خود بارہ بارہ گھنٹے روزانہ سلائی کا کام کرکے اپنے لڑکے کو پڑھانا شروع کیا۔

گھر کے حالات نے لڑکے کے اندر محنت کا جذبہ پیدا کیا۔ ہائی اسکول میں اس کو ۷۰ فی صد نمبر ملے۔ انٹرمیڈیٹ میں لڑکے نے ۷۶ فی صد نمبر حاصل کئے۔ اس کے بعد خاتون نے ہمت کرکے اپنے لڑکے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں انجنیئرنگ میں داخل کرا دیا۔ یہاں بھی لڑکا انتہائی محنت کے ساتھ پڑھتا رہا۔ انجنیئرنگ کے پہلے سال سے لے کر چوتھے سال تک اس نے اس طرح پاس کیا کہ ہر سال اس کو ۸۰ فی صد سے زیادہ نمبر ملتے رہے۔

لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے خاتون کا یہ منصوبہ بہت مہنگا تھا۔ اس مدت میں گھر کا اثاثہ ختم ہوگیا مکان گروی رکھنا پڑا۔ رات دن سلائی کا کام کرتے کرتے خاتون کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔

۱۹۸۱ اس لڑکے کا فائنل ایئر تھا۔ اگر وقت پر امتحان ہو جاتا تو لڑکا انجنیئر بن جاتا۔ اس کی ماں نے اسی دن کی امید میں دس نہایت مشقت کے سال گزار دئے تھے۔ وہ اس امید میں جی رہی تھی کہ میرا لڑکا انجنیئر بنے گا۔ پھر وہ کما کر گھر کا خرچ چلائے گا۔ قرضے ادا کرے گا۔ بہنوں کی شادی کروائے گا۔ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ مگر اس سال یونی ورسٹی کے لیڈر لڑکوں نے یونی ورسٹی میں ایسے ہنگامے شروع کئے کہ امتحان ہی نہ ہو سکے۔ خاتون کی دنیا بنتے بنتے اپنے آخری مقام پر پہنچ کر اجڑ گئی (حسب روایت احمد رشید شروانی مطبوعہ الجمعیۃ ۲۳ جون ۱۹۸۱)

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے مسائل کتنے نازک ہوتے ہیں۔ یہاں بے شمار مسائل ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ایک کو چھیڑنے میں دوسرا متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اجتماعی معاملات میں پڑنا صرف ان لوگوں کے لئے جائز ہے جو معاملات کو دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو دوسرے کے پیٹ کا درد اپنے سینہ میں محسوس کریں۔ جن لوگوں کے اندر یہ دونوں صفات نہ ہوں وہ اگر اجتماعی اصلاح کے میدان میں کودتے ہیں تو وہ صرف جرم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خاموش رہیں۔ نہ یہ کہ احمقانہ اقدام کرکے مسائل میں اور اضافہ کرنے کا سبب بن جائیں۔

نوجوانوں کے نام

جدید صنعتی دنیا کی ایک اصطلاح ہے جس کو کنجی گھماؤ منصوبہ (Turn-key project) کہا جاتا ہے۔اس سے مراد ایک ایسا مکمل طور پر بنا بنایا گھر یا کارخانہ ہے جس میں آدمی کا کام صرف کنجی گھما دینا ہو۔مسلمان موجودہ زمانہ میں جس طرح عمل کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دنیا کو وہ اپنے لئے اسی قسم کی جگہ سمجھتے ہیں۔ان کا خیال شاید یہ ہے کہ ان کے خدا نے ایک تیار شدہ دنیا ان کے حوالے کر دی ہے اور اب ان کا کام صرف یہ ہے کہ ایک کنجی گھما کر وہ اس کو اپنی مرضی کے موافق چلا دیں۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عمل اور مسابقت کی دنیا ہے۔یہاں ہمیں اول سے آخر تک سارا کام خود کرنا ہے۔ ہمیں دوسروں کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اسباب کی اس دنیا میں ہم کو اپنی مطلوبہ جگہ مل سکے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو چیز جاننا چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ وہ تاریخ کے آغاز میں ہیں، تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر وہ جنوری ۱۹۸۵ میں ہو تو دسمبر ۱۹۸۵ کے زمانہ میں پہنچنے کے لئے اس کو بارہ مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۰ بار گھومے گی اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارا ایک سال پورا ہو اور ہم تکمیل سال کے مرحلہ میں پہنچ سکیں۔

یہ اس دنیا کی انتہائی معلوم حقیقت ہے۔مگر اسی معلوم حقیقت کو مسلمان ملت کی تعمیر کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ عملاً پہلے مہینہ میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں۔ وہ بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے ہوئے نظر آئیں۔ واقعہ کے اعتبار سے وہ اپنے سفر کے آغاز میں ہوتے ہیں۔ اور ایسے انتہائی الفاظ بولتے ہیں گویا کہ وہ درمیانی راستہ طے کئے بغیر اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

یاد رکھئے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں۔ ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینا ہے جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔ان کے اندر وہ شعور پیدا کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔ یہ سارے کام جب قابل لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لئے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کی خندق میں چھلانگ لگانا ہے نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔

جھوٹا فخر

جس قوم کا ایک شاندار ماضی ہو اس کا بگاڑ ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے۔ یہ کہ اس کے اندر وہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے جس کو پدرم سلطان بود کہا جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کا معاملہ یہی ہے۔ مسلمان جب دین کو کھو دیں تو اس کے بعد ان کے پاس صرف تاریخ باقی رہ جاتی ہے۔ ذاتی طور پر اسلام سے خالی ہونے کے بعد وہ یہ کرتے ہیں کہ گزرے ہوئے بڑے لوگوں کا نام لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم فلاں اور فلاں شخصیتوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہم ایسے اور ایسے لوگوں کے وارث ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو بھی اپنے فخر کے خانہ میں لکھ لیتے ہیں جن کا تعلق خالصتہً نبوت سے ہے۔ مثال کے طور پر معراج کے واقعہ کے بارہ میں مسلم شاعروں کے یہ اشعار پڑھئے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ان اشعار میں بلند پروازی کا جو مضمون ہے وہ معراج کے واقعہ سے بطور تلمیح پیدا کیا گیا ہے۔ یہ توسیع درست نہیں کیوں کہ معراج کے واقعہ کا تعلق پیغمبر سے ہے نہ کہ عام مسلمانوں سے۔ مگر مسلمانوں کی فخر پسندی ان کو یہاں تک لے گئی کہ جو چیز استثنائی طور پر صرف پیغمبر کو دی گئی تھی اس کو "ہمارے پیغمبر" کی منطق سے انھوں نے اپنے خانہ میں ڈال لیا۔ حتی کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو پیغمبر سے بھی آگے بڑھا دیا۔ معراج کا واقعہ پیغمبر کے لئے عبدیت کا ایک تجربہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے لئے وہ گردوں کو زد میں لینا، خدا پر کمند ڈالنا، ستاروں کو گرد راہ بنانا بن گیا۔ اسی کا نام جھوٹا فخر ہے اور جھوٹا فخر حقائق کی اس دنیا میں سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مرض یہی جھوٹا فخر ہے۔ جھوٹے فخر کی یہ نفسیات کبھی خاندان کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ کبھی قوم اور مذہب کی بنیاد پر اور کبھی پیغمبر کا امتی ہونے کی بنیاد پر۔ مگر فخر کی تمام قسمیں سراسر باطل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی صرف وہ ہے جو وہ خود ہے نہ کہ وہ جو اس کے باپ دادا کبھی تھے۔

خود فریبی

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "شہید" کا لقب دے کر اس کی دھوم مچا رہے ہیں۔ اگر آپ ان صاحب کو شہید کے بجائے مقتول کہہ دیں تو وہ آپ سے اس طرح بگڑ جائیں گے جیسے کہ نعوذ باللہ آپ نے خدا کی شان میں کوئی گستاخی کر دی ہے۔ حالانکہ خود ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے ایسی زندگی کو پسند کئے ہوئے ہوں گے جس کا شہادت اور قربانی سے کوئی تعلق نہیں۔

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "بزرگ" بنا کر اس کی بزرگی کی جھوٹی کہانیاں خوب بیان کریں گے۔ اگر آپ ان بزرگ کے ساتھ مصنوعی القاب نہ لکھیں یا ان کا نام ایک عام آدمی کی طرح لے لیں تو وہ آپ پر اس طرح برس پڑیں گے جیسے کہ آپ نے کسی حرام فعل کا ارتکاب کر دیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ صرف الفاظ کی دنیا میں ہوگا۔ عملاً ان لوگوں کا اپنا حال یہ ہوگا کہ ان کی زندگی ان اوصاف سے ضروری حد تک بھی خالی ہوگی جن کو وہ اپنے مفروضہ بزرگوں میں مبالغہ آمیز حد تک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بظاہر غیر پرستی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خود پرستی کی بدترین قسم ہے۔ یہ کسی کی بڑائی کے نام پر اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش ہے۔ یہ دوسرے کی شہادت اور قربانی کا قصیدہ پڑھ کر اپنے آپ کو شہیدوں کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ یہ دوسروں کی بزرگی کا چرچا کر کے اپنے آپ کو بزرگوں کے زمرہ میں داخل کرنا ہے۔ یہ کچھ مسلّمہ شخصیتوں کو نمایاں کر کے ان کی فہرست کمال میں اپنا اندراج کرنا ہے۔ یہ اس نفسیات کو تسکین دینا ہے کہ ——— ہم خود بڑے نہیں، مگر ہم کو بڑوں سے نسبت تو حاصل ہے۔ حالانکہ اس قسم کی نسبت کی خدا کے یہاں کوئی حقیقت نہیں۔

جو لوگ ایسا کرتے ہیں انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے نہ کہ مفروضات کی دنیا۔ اس دنیا میں ہر آدمی حقیقت کے پیمانہ سے ناپا جا رہا ہے۔ ہر آدمی وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نسبت سے وہ قرار پاتے نہ کہ وہ جو وہ خود ساختہ مفروضات کے خانہ میں ظاہر ہو۔ بڑوں کی مدح خوانی سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نظر میں بڑا ہو۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: لیس للانسان الا ما سعیٰ۔

عظیم کوتاہی

۱۹۱۶ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی پہلی بار کانگرس کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی اس تاریخی اجلاس میں ایک جوشیلے نوجوان کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کی روایت کے مطابق اس وقت کے یوپی کے انگریز گورنر سر جیمس مسٹن نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے گوپی ناتھ امن کے الفاظ میں شستہ اردو میں تقریر کی جو اس وقت سامعین کے لئے بڑی دلپذیر ثابت ہوئی (صدق جدید ۱۹ اگست ۱۹۸۳)

برطانی راج کے زمانہ میں بہت سے انگریزوں نے اردو (یا ہندستانی زبان) سیکھی تھی۔ ان کے لئے اردو زبان سیکھنے کا محرک اگرچہ تمام تر سیاسی تھا۔ مگر اس نے ہمارے علماء کے لئے تبلیغ دین کا زبردست موقع پیدا کر دیا تھا۔ وہ علماء جو دین سے واقف تھے مگر انگریزی نہیں جانتے تھے، وہ کم از کم اردو داں انگریزوں سے مل کر ان کو خدا کے سچے دین سے واقف کرا سکتے تھے۔ اس طرح کچھ انگریزوں تک براہ راست طور پر اور بقیہ انگریزوں تک بالواسطہ طور خدا کا پیغام پہنچ جاتا اور وہ اپنی دعوتی ذمہ داری سے خدا کے یہاں سبک دوش ہو جاتے۔

مگر ایک پورا دور ختم ہو گیا۔ اور اس قیمتی امکان کو استعمال نہ کیا جا سکا۔ اس کی وجہ مواقع کی کمی نہیں بلکہ جذبہ کی کمی تھی۔ انگریز ہندستان میں آئے تو ہمارے علماء ان کو قومی دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انگریز ان کے لئے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئے۔ انگریزوں کے بارہ میں ہمارے علماء کے اندر قومی نفسیات تو پیدا ہوئی مگر ان کے اندر انگریزوں کے بارہ میں دعوتی نفسیات پیدا نہ ہو سکی۔

دعوت کا کام دوسرے لفظوں میں مدعو کو جنت کا راستہ دکھانے کا کام ہے۔ اس قسم کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر اپنے مخاطب کے لئے محبت اور خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہو۔ علماء جب انگریزوں سے نفرت کر رہے تھے تو وہ ان کو دعوت حق کا مخاطب نہیں بنا سکتے تھے۔ ہمارے علماء کی یہی عظیم الشان کوتاہی ہے جس کی سزا انھیں یہ ملی کہ وہ لوگ جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ جب ملک آزاد ہوا تو وہ یہاں سب سے پیچھے کی صف میں دھکیل دئے گئے۔ غلام ہندستان کے "امام" آزاد ہندستان کے "مقتدی" بن کر رہ گئے۔

خدائی معاشرہ

اسلامی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع ـــــ الرسالہ میں یہ مضمون دیکھ کر ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "مجھے اس امر میں آپ سے اتفاق ہے کہ اصل کام فرد کو خدا سے جوڑنے ہی کا ہے۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک صالح اجتماعیت کا وجود بھی ضروری ہے جو کہ فرد کو خدا سے جوڑنے میں اپنی اجتماعی صلاحیت کے دباؤ سے کام لیتی ہے"

فرد کو خدا سے جوڑنے کا یہ نظریہ اصل مسئلہ کے کم تر اندازہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے ایک انسان کا رب العلمین سے جڑنا اس سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے کہ کوئی مفروضہ اجتماعی دباؤ اس کو وقوع میں لاسکے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہی لوگ معیاری لوگ تھے جو انفرادی شعور کو بیدار کرنے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب "اجتماعی دباؤ" کا زمانہ آیا تو دوبارہ ویسے لوگ پیدا نہ ہوسکے۔

انسان انسان سے نہیں ڈرتا۔ انسان صرف خدا سے ڈرتا ہے۔ اور خدا سے ڈرنے کے لئے خود خدا کا دباؤ درکار ہے نہ کہ انسان کا دباؤ۔ خدا کا دباؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ خدا کی یاد اور خدا کی کائنات میں غور کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد کے اندر ربانی جذبہ پیدا کرنے کا ذریعہ انسانی معاشرہ نہیں بلکہ خدائی معاشرہ ہے۔ کائنات گویا ایک وسیع معاشرہ ہے جو خدا نے براہ راست اپنے انتظام کے تحت قائم کر رکھا ہے۔ کائنات دہشت ناک حد تک عظیم ہے۔ ایک بندہ جب پھیلی ہوئی کائنات میں غور کرتا ہے تو اس میں وہ خدائی کمالات کی جھلکیاں پاتا ہے۔ کائنات اس کو مالک کائنات سے متعارف کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسلامی دعوت کا کام، ایک اعتبار سے، انسان کو اسی خدائی جلوہ گاہ سے جوڑنا ہے۔ اسلامی دعوت کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ابھارے کہ وہ کائنات کی عظمتوں کو دیکھ کر خدا کی عظمتوں کو محسوس کرسکے۔

انسانی معاشرہ مخصوص حالات میں جزئی اور محدود دباؤ کا کام کرسکتا ہے۔ مگر اس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ انسانی شعور کو جگائے، وہ کسی شخص کے اندر روحانی بیداری پیدا کرے، وہ انسان کے اندر وہ تڑپ پیدا کرے کہ وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔ اس مقصد کے لئے بے حد طاقتور عامل کی ضرورت ہے۔ ایک فرد کے اندر ربانی احساس جگانے کے لئے لامحدود کائنات کی وسعت درکار ہے۔ محدود انسانی معاشرہ کبھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

اسلام کی نفی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کو زمین میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو (اور ان کی متوقع نسلوں کو) مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جا کر زمین میں بسو۔ تمہارا البعض تمہارے بعض کا دشمن ہوگا۔ پس جب تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا (طہ ۱۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسانوں کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہوکر لڑنے لگیں۔ انسانوں کا دو گروہ بن کر باہم لڑنا انسانی بگاڑ کی خاص علامت ہے۔ حضرت آدم کے زمین میں آباد ہونے کے بعد آپ کے فرزند ہابیل اور قابیل سے اس باہمی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ کے بیشتر حصوں میں یہی صورت حال جاری رہی ہے۔

تاہم قدیم زمانہ اور جدید زمانہ میں ایک فرق ہے۔ قدیم زمانہ کی لڑائیاں ضد اور ظلم کے جذبہ کے تحت ہوتی تھیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ باہمی ٹکراؤ فلسفیانہ جواز کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ فلسفیانہ جواز موجودہ زمانہ میں دو قسم کے لوگوں نے فراہم کیا ہے۔ اولاً اشتراکی مفکرین نے، اور اس کے بعد اسلامی مفکرین نے۔ اشتراکی مفکرین نے یہ کام "حکومتِ مزدور" کے نعرہ کے تحت کیا اور اسلامی مفکرین نے "حکومتِ الٰہیہ" کے نعرہ کے تحت۔

اشتراکی فلسفہ نے موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ لوگوں کی آزادیاں چھین لیں۔ ان کو ان کی جائدادوں سے محروم کریں۔ ان کو بے دریغ قتل کریں۔ ان کو ناقابل بیان مصائب میں مبتلا کر دیں۔ اس کے باوجود ان تمام مظالم کے جواز کے لئے ان کے پاس ایک خوبصورت فلسفہ موجود ہو۔ ٹھیک اسی طرح جدید اسلامی مفکرین کے نظریات نے انھیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دو طبقوں (حکمراں طبقہ اور انقلاب پسند طبقہ) میں تقسیم کر کے انھیں ایک دوسرے سے لڑائیں اور اس کو اسلامی جہاد کہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی باہمی جنگ حرام ہے۔ وہ اقتدار پا کر انسان سے ہر قسم کی آزادی چھین لیں اور اپنے مخالفین کو کچلنے کے تمام وحشیانہ طریقے استعمال کریں اور اس کے باوجود ان کا اسلامی فلسفہ ان کو جائز ثابت کرنے کے لئے موجود ہو۔

اشتراکی مفکرین نے عدل کے نام پر عدل کی نفی کی تھی، اسلامی مفکرین اسلام کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔

قومی نہ کہ دینی

اخبار ٹیلی گراف (کلکتہ) کی ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں صفحہ تین پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں ایک کالے بچہ کے ساتھ ایک سفید نسل کی بچی بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ایک کھلی ہوئی کتاب کے سامنے جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی اسرائیلی لڑکی ایک باتصویر کتاب کے ذریعہ ایتھوپیا کے ایک چھوٹے لڑکے کو عبرانی زبان سکھا رہی ہے۔ یہ تصویر ایلیات کی ہے جو بحر احمر کے کنارے واقع ہے۔ یہ بچہ ان ہزاروں یہودیوں میں سے ایک ہے جو حال میں اسرائیل پہنچے ہیں:

A little Israeli girl using a picture book to teach Hebrew to an Ethiopian boy at Eliat on the Red Sea coast. The boy arrived with thousands of other Ethiopians recently.

۱۹۸۴ میں ایتھوپیا (افریقہ) میں غیر معمولی قحط پڑا۔ انسان اور جانور بھوک سے مرنے لگے۔ یہاں یہودی تقریباً ۲۵ ہزار کی تعداد میں آباد ہیں جن کو فلاشا کہا جاتا ہے۔ اسرائیل کی حکومت نے یہ منصوبہ بنایا کہ ان یہودیوں کو اسرائیل میں بسایا جائے۔ ان کو ایتھوپیا سے اسرائیل لانے کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی گئی اس کا سرکاری نام عمل موسٰی (Operation Moses) رکھا گیا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم شیمون پیریز (Shimon Peres) نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس عظیم انسانی خدمت کے کام کو ہم جاری رکھیں گے۔ ہم اس وقت تک اس سے باز نہ آئیں گے جب تک ایتھوپیا کا آخری یہودی ہمارے پاس نہ آجائے:

We shall continue this noble and humane rescue act and shall not interrupt it until the last of Ethiopia's Jews has arrived with us.

حضرت موسٰی کے زمانہ میں یہود مصر میں آباد تھے۔ آپ ان کو خدائی منصوبہ کے تحت مصر سے نکال کر سینا میں لے گئے۔ اسی ظاہری مشابہت کی بنا پر ایتھوپیا کے یہودیوں کو وہاں سے نکال کر اسرائیل لے جانے کو مذکورہ نام دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قومی واقعہ کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ یہی مسلمان بھی موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قومی تحریک کو دعوت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ اپنی قومی بھگدڑ کو ہجرت کہتے ہیں۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کے لئے جہاد کا پر فخر لفظ پالیتے ہیں۔ مگر ایک چیز جو باعتبار حقیقت قومی ہو وہ خدا کے نزدیک قومی ہی رہے گی۔ دینی الفاظ بولنے سے وہ دینی نہیں ہو جائے گی۔

شیطانی فریب

۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ کو میری ملاقات ایک مصری نوجوان سے ہوئی۔ وہ لندن کے ایک عربی رسالہ کے نامہ نگار ہیں۔ یہ عربی رسالہ ایرانی انقلاب کی حمایت میں نکالا گیا ہے۔ مصری نوجوان سے میری جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"میں امام خمینی کا عاشق ہوں"

"کیوں"

"وہ جدید تاریخ کے پہلے مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسلام دشمن طاقتوں کو ذلت آمیز شکست دی"
یہ گفتگو بتاتی ہے کہ بہت سے مسلمان جو امام خمینی کے پرجوش حمایتی ہیں اس کا اصل راز کیا ہے۔ اس کا راز تمام تر منفی ہے نہ کہ مثبت۔ جو لوگ قومی اور سیاسی اسباب کے تحت مغربی قوموں کی نفرت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے انھوں نے خمینی انقلاب کے واقعہ میں یہ تسکین پائی کہ اس نے ___ ہم کو ذلیل کرنے والوں کو ذلیل کر دیا۔ امام خمینی کی یہ حمایت مفروضہ اسلام دشمنوں کو شکست دینے کی بنا پر ہے نہ کہ خود اسلام کو قائم کرنے کی بنا پر۔ اس خوشی کا راز قومی مراد کو پالینا ہے نہ کہ اسلامی مراد کو پالینا۔

لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ منفی بنیاد بھی محض خیالی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جس کو امام خمینی نے "ذلت آمیز" شکست دی ہے۔ وہ در اصل خود ایران کا مسلم بادشاہ ہے نہ کہ وہ اسلام دشمن طاقتیں جن کو روس اور امریکہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امام خمینی کی "فتح" کا تعلق امریکہ اور روس سے نہیں۔ بلکہ خود ایران کے مسلم بادشاہ سے ہے۔ پرجوش مجاہدین نے اولاً شاہ ایران کو "دشمنوں کا ایجنٹ" کا لقب دیا۔ اس کے بعد اس کو فتح کر کے اعلان کر دیا کہ ہم نے اسلام دشمن طاقتوں کے اوپر فتح پائی ہے۔

اسی کو قرآن میں تزئین اعمال کہا گیا ہے۔ یعنی برے اعمال کو اچھا کر کے دکھانا۔ مسلمان آج اسی شیطانی فریب میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو قتل کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتد کو قتل کیا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم اسلام دشمن عناصر کو ذلیل کر رہے ہیں۔ وہ اپنے حکمراں کو تخت سے اتارتے ہیں اور پھر اس طرح یوم فتح مناتے ہیں جیسے انھوں نے کافروں اور مشرکوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔

اونٹ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اونٹ کو دیکھو کہ خدا نے کس طرح اسے بنایا ہے (الغاشیہ ۱۷)
حقیقت یہ ہے کہ اونٹ بڑا عجیب و غریب جانور ہے۔ اونٹ کی تخلیق پر غور کرنے سے خدا کی عجیب و غریب نشانیاں انسان کے سامنے آتی ہیں۔

وہ تمام فائدے جو دوسرے جانوروں میں ہیں وہ اونٹ میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مثلاً اس سے دودھ، گوشت، اون، چمڑا اور دوسری چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اونٹ کی انوکھی صفت یہ ہے کہ وہ صحرا کا جہاز (سفینۃ الصحراء) ہے۔ اونٹ کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ صحراء کے ناقابل برداشت سفر میں انسان کا رفیق بن سکے۔

ریگستانوں میں بہت دور دور تک پانی نہیں ملتا جب کہ زندگی کے لئے پانی انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ اونٹ میں یہ عجیب و غریب صفت ہے کہ وہ متواتر ایک مہینہ تک یا اس سے بھی زیادہ پانی کے بغیر رہ سکتا ہے۔ وہ اپنے مسافر کو لئے ہوئے چار سو کلومیٹر تک جا سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس کو پانی کا ایک قطرہ ملا ہو۔ اس کے بعد اگر کہیں پانی کا چشمہ مل جائے تو اس کے اندر مزید یہ عجیب و غریب صفت ہے کہ بیک وقت وہ اپنے پیٹ کو اس طرح بھر سکتا ہے جیسے وہ کوئی پانی کی ٹنکی ہو۔ وہ صرف دس منٹ کے اندر ایک سو لیٹر پانی اپنے اندر داخل کر سکتا ہے جو آئندہ کئی ہفتے تک اس کے کام آتا رہے۔

اونٹ کے اندر یہ عجیب بات ہے کہ وہ ایک وحشی جانور ہے پھر بھی وہ پالتو جانوروں میں شامل ہے۔ وہ سرکش ہے اور اسی کے ساتھ تابعدار بھی۔ وہ سخت غصہ ور ہے اور اس کے باوجود صابر بھی۔
پانی زندگی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ پھر ریگستان کے سفر میں جب اونٹ کو کہیں پانی نہیں ملتا تو وہ اپنی پانی کی ضرورت کو کس طرح پوری کرتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اونٹ کا کوہان عملاً پانی کا کارخانہ ہے۔ کوہان حقیقۃً چربی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جب پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو اونٹ اپنے جسم کے اندر کسی پراسرار کیمسٹری کے ذریعہ چربی کو پانی میں تبدیل کرنا شروع کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی پانی کی ضرورت پوری کر لیتا ہے۔

(الوعی الاسلامی شوال ۱۴۰۴ھ)

آیت فتنہ

حضرت امام حسن بن علی نے ۴۱ھ میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ خلافت سے دست برداری اختیار کرلی۔ اس وقت سے خلافت بنو امیہ کے خاندان میں چلی گئی۔ تاہم امیر معاویہ کی وفات (۶۰ھ) کے بعد بار بار خلافت کے دعویدار اٹھتے رہے اور بنو امیہ میں اور ان مدعیان خلافت میں جنگ جاری رہی۔

انھیں میں سے ایک عبد اللہ بن زبیر تھے۔ ان کا صدر مقام مکہ تھا۔ انھوں نے بنو امیہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ بنو امیہ کے عامل حجاج بن یوسف سے ان کی جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۷۳ھ میں وہ مکہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ فتنہ ابن زبیر کے زمانہ میں دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ برباد ہو رہے ہیں اور آپ عمر فاروق کے صاحبزادے ہیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ پھر کیا چیز آپ کو روک رہی ہے کہ آپ ان سے جنگ کے لیے نہیں نکلتے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کے خون کو میرے لئے حرام کر دیا ہے۔ آدمیوں نے کہا کیا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا، ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا۔ اور دین اللہ کے لئے ہوگیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے۔

دوسری روایت میں ہے کہ دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن، کیا وجہ ہے کہ آپ ایک سال حج کرتے ہیں اور ایک سال مقیم رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کس قدر زیادہ اس کی اہمیت دلائی ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، اور پانچ وقت کی نمازیں، رمضان کے مہینہ کا روزہ رکھنا، اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ آدمیوں نے کہا اے ابو عبد الرحمٰن کیا آپ نہیں سنتے جو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ ابن عمر نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کیا۔ اس وقت اسلام کم تھا، پس آدمی اپنے دین کے معاملہ میں

فتنہ میں ڈالا جاتا تھا۔ لوگ اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہوگئی۔ پھر فتنہ باقی نہ رہا (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۸ - ۲۲۷)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ مسلمانوں کو سیاسی شکایت ہوگئی۔ وہ مدینہ میں گھس آئے اور آپ کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حضرت عثمان اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور باغیوں سے کہا کہ تم جو میرا محاصرہ کئے ہوئے ہو اور میرے قتل کے درپے ہو، کیا اپنے اس فعل کے حق میں تمہارے پاس قرآن کی کوئی دلیل ہے۔ ایک باغی آگے بڑھا اور اس نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے قرآن سے جہاد اور قتال والی آیتیں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔

باغیوں کے نزدیک اپنے عمل کے لئے ان آیتوں کا حوالہ درست تھا۔ کیوں کہ اپنے خیال میں وہ ایک بگڑی ہوئی حکومت کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور جہاد کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ مگر حضرت عثمان نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں۔ یہ میرے اور میرے ساتھیوں (صحابہ) کے حق میں اتری ہیں۔

حضرت عثمان کا جن لوگوں نے محاصرہ کر رکھا تھا وہ سب مسلمان تھے۔ ان کے پاس اپنے محاصرہ کو برحق ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیتیں بھی تھیں۔ مگر صحابہ نے اس معاملہ میں ان سے اتفاق نہیں کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ انھوں نے قرآنی آیات کی تفسیر اور تشریح میں غلطی کی (اخطأوا فی التاویل) یعنی جن آیتوں کا تعلق کافروں اور مشرکوں سے ہے۔ ان کو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

"خوارج" سب کے سب مومن و مسلم تھے۔ وہ دیندار اور عبادت گزار بھی تھے۔ وہ ہر بات میں قرآن کی آیتیں پیش کرتے تھے۔ مگر خلیفہ چہارم حضرت علی کے خلاف ان کی جنگ کو امت نے کبھی صحیح نہیں قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے خوارج کی لڑائیوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ قرآن کی وہ آیتیں جو کافروں اور مشرکوں سے جنگ کے بارہ میں اتری ہیں ان کو انھوں نے مسلمانوں کے اوپر منطبق کر دیا ہے۔ وہ قرآن کی تحریف کر رہے نہ کہ قرآن کی تفسیر۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ کی انقلابی اسلامی جماعتیں جو اپنے ملکوں میں مسلم حکمرانوں سے اصلاح سیاست کے نام پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔ اس قسم کی لڑائیوں کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمام مفکرین اسلام درحقیقت مجرمین اسلام ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی باہمی جنگوں کو جہاد فی سبیل اللہ ثابت کرنے کے لئے اپنی ذہانت صرف کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اعمال کے لئے قرآن کی آیتیں پیش کرنا بے عملی پر سرکشی کا اضافہ کرنا ہے۔

عورت اسلام میں

مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کو سمجھنے کے لئے قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے: انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض (آل عمران ۱۹۵) اس آیت کا ترجمہ دو مترجمین کا کیا ہوا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو (مولانا اشرف علی تھانوی)

I waste not the work of any of you, be he male or female, you are members, one of another. (Abdulla Yusuf Ali)

اس آیت کی شان نزول کے بارہ میں ایک روایت آتی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن ام سلمة قالت یارسول اللہ انی اسمع اللہ یذکر الرجال فی الھجرۃ (او فی القرآن) ولا یذکر النساء فنزلت ھذہ الآیۃ۔ اخرجہ الترمذی والحاکم وصححہ وابن ابی حاتم وعبد الرزاق وسعید ابن منصور (التفسیر المظہری)

حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں سنتی ہوں کہ اللہ مردوں کا ذکر فرماتا ہے مگر وہ عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس پر یہ آیت اتری۔

سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت (بعضکم من بعض) میں مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کے بارہ میں نہایت جامع بیان موجود ہے۔ اس بات کو اگر موجودہ زمانہ کے الفاظ میں کہنا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "مرد اور عورت ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں"۔ دونوں ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے برابر کے ساتھی ہیں۔

حیاتیاتی اعتبار سے اگرچہ دونوں کی صنف ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک صنف مذکر ہے اور دوسری صنف مونث۔ مگر انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں بالکل یکساں ہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔

تقسیم کار کا اصول

تاہم سماجی زندگی میں اسلام نے دونوں کے عمل کے درمیان ایک حد تک تقسیم کار کا اصول اختیار

کیا ہے۔ مرد کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر اندر اس تقسیم کا کوئی بھی تعلق امتیاز سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں کی صنفی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔ دونوں اپنی پیدائشی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لا سکیں، بغیر اس کے کہ خاندان یا سماج کے اندر کوئی رخنہ واقع ہو۔ بالفاظ دیگر، یہ فرق انتظام کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اعزاز کی بنیاد پر۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لئے جو چیزیں درکار ہیں وہ عورتوں کے لئے بھی وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں۔ آخرت کی نجات کا مستحق بننے کے لئے عورتوں کو بھی وہی کرنا ہے جو مردوں کو کرنا ہے۔

دنیا میں زندگی کا انتظام چلانے کے لئے عورت اور مرد کے اندر حیاتیاتی فرق رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بعض امور میں دونوں کے حدود کار ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ تاہم خدا کی رضا اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کے لئے جو بنیادی شرط درکار ہے وہ ایک صنف کے لئے بھی وہی ہے جو دوسری صنف کے لئے ہے۔

اسلام کا آغاز حقیقۃً خدا کی شعوری دریافت سے ہوتا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان اگر حقیقی ہو تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت خدا کے آگے جھک پڑتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کا اثاثہ خدا کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ خدا کی خاطر وہ صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ چھوڑ دیتے ہیں اور سچ بولنے والے بن جاتے ہیں۔

وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں سال کے ایک مہینہ میں کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات پہ کنٹرول کرتے ہیں۔ اپنی عبدیت کا شعور اور خدا کی معرفت ان کا یہ حال کر دیتی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

آیات قرآن

یہی وہ چیزیں ہیں جو خدا کو ہر فرد کے اندر درکار ہیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ قرآن میں یہ بات مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور

والحافظین فروجھم والحافظات والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما (الاحزاب ۳۵)

عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں وہ تمام بنیادی صفات بتادی گئی ہیں جو اس مرد یا عورت میں ہونی چاہئیں جو اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہے۔

اسلام —— پہلی چیز اسلام بتائی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا نفس اللہ کی اطاعت پر راضی ہو جائے۔ وہ اللہ کے احکام کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔

ایمان —— اس سے مراد وہ شعوری یافت ہے جب کہ آدمی خدا کو اپنے خالق اور معبود کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی کا فکر خدا کے فکر میں ڈھل جائے۔ جب آدمی اس یقین تک پہنچ جائے کہ سب سے بڑی حقیقت وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ انسان کے لئے ظاہر کی ہے۔

قنوت —— یعنی مخلصانہ فرماں برداری۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کر لیا جائے جو خدا اور رسول نے بتایا ہے۔

صدق —— اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے۔ یعنی وہی کہنا جو آدمی کرنے والا ہو اور وہی کرنا جو اس نے اپنی زبان سے کہا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ ایک صاحب کردار انسان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔

صبر —— یعنی دین کے احکام پر چلنے کے لئے اگر تکلیفیں اٹھانی پڑیں تب بھی اس سے نہ ہٹنا۔ نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر قائم رہنا۔ غیر خدائی محرکات کی بنا پر خدائی رشتہ کو نہ چھوڑنا۔

خشوع —— اس کا مفہوم تواضع اور خاکساری ہے۔ یہ کیفیت وہ ہے جو خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے اوپر سب سے زیادہ جو چیز چھائی ہوتی ہے وہ خدا کا خوف ہے۔ یہ احساس ان کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے۔ اور دوسرے انسانوں کے سامنے بھی

ان کو متواضع اور مہربان بنادیتا ہے۔

صدقہ ـــــ یعنی وہ اپنے مال میں سے بندوں کا حق ادا کرتے ہیں۔ جس طرح اپنی ضرورت کا احساس انھیں اپنے اوپر خرچ کرنے پر مجبور کرتا ہے اسی طرح وہ دوسرے حاجت مندوں کی امداد سے بھی بے پروا نہیں ہوتے۔

صوم ـــــ یعنی اللہ کے لئے روزہ رکھنا۔ روزہ رکھ کر آدمی اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتا ہے جب کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تجربہ کرے اور پھر اس رزق پر خدا کا شکر ادا کرے جو خدا نے اس کو اپنے پاس سے عطا کیا ہے۔

حفظ فروج ـــــ یعنی عفت اور پاک دامنی کا طریقہ اختیار کرنا اور بے حیائی والے اعمال سے بچنا۔ حیا کا فطری پردہ جو خدا نے پیدا کیا ہے، اس کا پورا لحاظ رکھنا۔

ذکر اللہ ـــــ خدا کو بہت زیادہ یاد کرنا خدا کی حقیقی دریافت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو کوئی خدا کو حقیقی طور پر پالیتا ہے اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ ہر موقع پر اس کو خدا یاد آتا ہے وہ دل اور زبان سے بار بار خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سورہ التحریم (آیت ۵) میں عورتوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں تین مزید صفتوں کا ذکر ہے: توبہ، عبادت، سیاحت۔

توبہ ـــــ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا۔ یعنی غلطی کر کے پلٹ آنا۔ یہ مومن اور مومنہ کی نہایت خاص صفت ہے۔ اس دنیا میں ایسے امتحانی اسباب رکھے گئے ہیں کہ آدمی سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر یہ ہونا چاہئے کہ نفس کے غلبہ سے آدمی وقتی طور پر غلطی کر جائے۔ اس کے بعد خدا کی پکڑ کا احساس اس پر طاری ہو اور وہ فوراً پلٹ کر خدا سے معافی مانگنے لگے۔ یہ توبہ اپنے مقابلہ میں خدا کی عظمت کا اعتراف ہے۔ وہ اللہ کو بہت پسند ہے۔

عبادت ـــــ عبادت سے مراد وہ عمل ہے جو کسی کی فوق الفطری بڑائی کو مان کر اس کے سامنے کیا جائے۔ اسی کو پرستش کہتے ہیں۔ اس قسم کی پرستش اللہ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں۔ مومن اور مومنہ کی عبادت صرف خدا کے لئے ہوتی ہے۔

سیاحت ـــــ اس کی بہترین تشریح اس حدیث میں ملتی ہے جو ابو داؤد میں آئی ہے:

عن ابی امامۃ ان رجلا قال، یا رسول اللہ ائذن لی فی السیاحۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ	حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول مجھ کو سیاحت (درویشی) کی اجازت دیجئے

علیہ وسلم سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ آپ نے فرمایا: میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

سیاحت سے مراد اللہ کے راستہ کا وہ عمل ہے جس کی خاطر چلنا پھرنا پڑے۔ مثلاً علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا۔ دین کی خاطر ایک مقام چھوڑ کر دوسرے مقام کو ہجرت کرنا۔ نصیحت کی غرض سے فطرت کے مناظر اور تاریخی عبرت کے مقامات کو دیکھنے کے لئے جانا۔ اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا وغیرہ۔

اوپر جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب وہ ہیں جن کا تعلق کسی خاص صنف سے نہیں، ان کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ یہی چیزیں اسلام کی اصل ہیں اور یہی فلاح و نجات کا ذریعہ ہیں، عورتوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کی رائے میں سائحون سے وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن کی آیت افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او آذان یسمعون بھا (الحج ۴۶) کا مصداق ہیں۔

خواتین اسلام کی مثال

تاہم دین کے معاملہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے جس طرح مردوں کے دو درجے ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک عام دوسرا خاص۔

عام درجہ وہ ہے جو ہر خاتون کے لئے ہے۔ یعنی ذاتی معاملہ میں خدا اور بندوں کے حقوق ادا کرنا۔ خدا کے بارہ میں عقیدہ کی درستگی۔ خدا کے احکام کی بجا آوری۔ زندگی کے معاملات میں انصاف پر قائم رہنا۔ نفسانی محرکات اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنا۔ اپنی ذات اور اپنے مال سے خدا کا حق نکالنا۔ ہمیشہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو سامنے رکھنا۔ اپنے گھر اور اپنے متعلقین کے درمیان اسلامی اخلاق کے ساتھ رہنا۔ معاملات میں ہمیشہ وہ کرنا جو اسلام کا تقاضا ہے۔

عورت کا دوسرا اہم فرض اپنے بچوں کی اصلاح و تربیت ہے۔ ہر عورت بالآخر ماں بنتی ہے۔ بچے سے ماں کا اور ماں سے بچہ کا بے حد گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق بگاڑ کا سبب بھی بن سکتا ہے اور بناؤ کا بھی ــــ مسلمان ہونے کی حیثیت سے عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس تعلق کو صرف بناؤ اور اصلاح کے لئے استعمال کرے۔

تیسری چیز جو ہر عورت کے لئے ضروری ہے وہ یہ کہ اپنے شوہر کے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے

مسئلہ نہ بنے۔ زندگی میں "کیا کیا جائے" سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ "کیا نہ کیا جائے" اس معاملہ میں عورتوں سے جذباتی ہونے کی بنا پر کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ غیر ضروری قسم کے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے گھر کا سکون غارت ہوجاتا ہے۔ بظاہر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے گھر میں کچھ نہیں۔ عورت اگر اتنا کرے کہ وہ گھر کے اندر مسئلہ نہ پیدا کرے تب بھی اس نے بہت بڑا کام کیا۔

اگر عورت کے اندر مزید صلاحیت ہو اور اس کو وسیع تر مواقع حاصل ہوں تو وہ اس کے آگے کا کام بھی کر سکتی ہے جس کو ہم نے خصوصی درجہ کا نام دیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت عائشہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے بھرپور استفادہ کیا۔ غالباً ان کا حافظہ وہ تھا جس کو موجودہ زمانہ میں عکسی حافظہ (Photographic memory) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی باتوں کو اچھی طرح یاد رکھا۔ وہ چوں کہ رسول اللہ کے مقابلہ میں بہت کم عمر تھیں، اس لئے آپ کی وفات کے بعد تقریباً ۵۰ سال تک زندہ رہیں۔ وہ امت کے لئے ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر ثابت ہوئیں۔ اور آپ کی وفات کے نصف صدی بعد تک آپ کی باتیں لوگوں کو سناتی رہیں۔ عبد اللہ ابن عباس صحابہ کے درمیان بہت بڑے عالم تھے۔ وہ حبر الامۃ کہے جاتے ہیں۔ اور قرآن کی تفسیر میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ یہ عبد اللہ ابن عباس حضرت عائشہ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے علم دین زیادہ تر حضرت عائشہ سے سیکھا، اسی طرح بہت سے صحابہ و تابعین آپ سے علم دین سیکھتے رہے ـــــ اس مثال میں ایک اسلامی خاتون علم دین میں مہارت پیدا کر کے لوگوں کی رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مہر کی مقدار کم ہوتی تھی۔ بعد کو جب فراخی کا دور آیا تو لوگ مہر کی رقم زیادہ مقرر کرنے لگے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک بار منبر پر آئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا میں نہیں جانتا کہ چار سو درہم مہر پر کس نے زیادتی کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کے اصحاب کا مہر آپس میں چار سو درہم یا اس سے کم ہوتا تھا۔ حضرت عمر نے مزید کہا کہ خبردار تم لوگ عورتوں کے مہر میں زیادتی مت کرو۔ جب بھی مجھے معلوم ہوگا کہ کسی نے رسول اللہ کے مہر سے زیادہ مہر باندھا ہے تو میں اس زیادتی کو ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دوں گا۔

اس کے بعد مجمع کے گوشہ سے ایک عورت اٹھی۔ اس نے کہا کہ اے امیر المومنین، اللہ کی کتاب زیادہ

اتباع کے قابل ہے یا آپ کا قول۔ حضرت عمر نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ عورت نے کہا کہ ابھی آپ نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کریں۔ حالانکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے (واتیتم احداهن قنطاراً فلا تاخذوا منه شیئاً) یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا کہ ہر ایک عمر سے زیادہ عالم ہے (کل احد افقه من عمر، حیاۃ الصحابہ، جلد ۲، صفحہ ۶۷۷) ـــــ اس مثال میں ایک عورت دینی بات کا مجمع عام میں اعلان و اظہار کر رہی ہے۔

امام ابو جعفر طحاوی (۲۲۹-۳۲۱ھ) ایک مشہور محدث ہیں۔ ان کی کتاب طحاوی حدیث کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اور عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ امام طحاوی نے یہ کتاب اپنی بیٹی سے املا کرائی ہے۔ اس کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ باپ حدیث پڑھ کر سناتے اور اس کے مطالب بیان کرتے اور بیٹی ان کے پاس بیٹھی ہوئی لکھتی جاتی۔ اس طرح پوری کتاب تیار ہو گئی ـــــ اس مثال میں عورت دین کے معاملہ میں اپنے محرم رشتہ دار کی معاونت کر رہی ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے کہاں تک آگے جا سکتی ہے۔

کیسٹ میگزین

اسلامی مرکز کے تحت ـــ انشاء اللہ جلد ہی ایک نیا پروگرام شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ "کیسٹ میگزین" ہے۔ اس پروگرام کے تحت ـــ ہر ماہ ایک گھنٹہ کا ایک کیسٹ تیار کیا جائے گا جو صدر اسلامی مرکز کی تقریر پر مشتمل ہوگا اور پھر اس کی نقلیں تیار کر کے ہر ماہ بذریعہ ڈاک روانہ کی جائیں گی۔ جو لوگ کیسٹ میگزین کے خریدار بننا چاہیں وہ بذریعہ خط مطلع فرمائیں۔ اس کی قیمت وغیرہ کے بارہ میں انشاء اللہ آئندہ اعلان کیا جائے گا۔

سکریٹری اسلامی مرکز

۱. اسلامی مرکز کا مشن خدا کے فضل سے عالمی دلچسپی کا مرکز بن رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دیگر اسباب کے علاوہ انگریزی ماہنامہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک امریکی عالم مسٹر ہیوسٹن اسمتھ مرکز میں آئے۔ اور صدر اسلامی مرکز سے ملے۔ وہ مینی سوٹا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ ان کا خصوصی موضوع مختلف مذاہب کا تقابلی اور تاریخی مطالعہ ہے۔ وہ مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً مذاہب انسانی (The religions of Man) اور فراموش سچائی (Forgotten Truth) وغیرہ پروفیسر موصوف سے تقریباً آدھ گھنٹہ تک باتیں ہوئیں۔ آخر میں ان کو اسلامی مرکز کا انگریزی تعارف نامہ اور انگریزی رسالہ دیا گیا۔ ان کا نام اور پتہ یہ ہے:

Prof. Huston Smith
130, Avenida Drive, Berkeley, California, U.S.A.

۲. "نیشنل اسٹوڈنٹس فورم" کے تحت نئی دہلی (ایوان غالب) میں ۱۸-۱۹ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک دو روزہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف نے ۱۹ جنوری کی آخری نشست میں شرکت کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں مرکز کا تعمیری پروگرام حاضرین کے سامنے رکھا۔ ایوان غالب کا وسیع ہال مکمل طور پر سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی اس تقریر میں خاص طور پر نوجوان طبقہ کو خطاب کیا اور تاریخی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ان کو چاہئے کہ اپنا وقت اور قوت ایسے کاموں میں لگائیں جو حقیقی معنوں میں نتیجہ خیز ہو سکیں۔ اس تقریر کا ٹیپ اسلامی مرکز میں موجود ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے نیشنل اسٹوڈینٹس فورم کے سووینئر کے لئے ایک پیغام بھی دیا جو زیر نظر اشاعت میں "نوجوانوں کے نام" کے عنوان سے شامل ہے۔

۳. اسلامی مرکز کی لائبریری میں حال میں جن قیمتی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے اس میں سے ایک انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا تازہ اڈیشن (۱۹۸۴) ہے۔ یہ اڈیشن ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور نئی ترتیب کے ساتھ خصوصی اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔

۴۔ کچھ دن پہلے یہ حال تھا کہ بہت سے لوگ ملاقات کے وقت یہ پوچھتے تھے کہ "کیا الرسالہ نکل رہا ہے" مگر اب خدا کے فضل سے الرسالہ ابتدائی مرحلہ سے نکل کر دور استحکام میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے خریدار اور ایجنسی مسلسل ہر جگہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو بیک وقت ایک سو شمارہ سے ایجنسی کا آغاز کر رہے ہیں۔ ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک صاحب مرکز میں آئے اور الرسالہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ الرسالہ محض ایک ماہنامہ نہیں وہ ایک مشن ہے۔ آپ کو اس مشن میں اپنے آپ کو شامل کرنا چاہئے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ آپ اس کی ایجنسی لیں۔ انھوں نے فوراً ایک سال کی پیشگی رقم جمع کر کے دس شماروں سے ایجنسی شروع کر دی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو پانچ اور چھ سال کا سالانہ چندہ اکٹھا جمع کر کے الرسالہ اپنے نام جاری کراتے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ اپنی ساری سنجیدگی کے باوجود عمومی پرچہ بنتا جا رہا ہے۔

۵۔ تذکیر القرآن دوبارہ نئی ترتیب کے ساتھ زیر طبع ہے۔ یہ جلد سورہ فاتحہ سے سورہ بنی اسرائیل تک (پندرہ پاروں) پر مشتمل ہوگی۔ جو لوگ اس سے پہلے دس پاروں کی جلد لے چکے ہیں۔ ان کے لئے دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مزید پانچ پاروں کے صفحات دفتر سے منگوا کر اپنی جلد مکمل کر لیں۔ یا سابقہ جلد ہمیں واپس کر دیں اور جزئی اضافی قیمت ادا کر کے نئی جلد پندرہ پاروں کی حاصل کر لیں۔

۶۔ متعدد مقامات سے ہم کو خطوط اور رپورٹیں ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے تذکیر القرآن کو مساجد میں پڑھ کر سنانے کے لئے بہت موزوں پایا ہے۔ ایک مقام سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے شہر کی چار مسجدوں میں تذکیر القرآن پڑھ کر سنانے کا انتظام کیا ہے۔ بعض مساجد میں دن میں کئی بار تذکیر القرآن پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ ایک مقام سے رپورٹ ملی ہے کہ ایک صاحب پچھلے دو سال سے تذکیر القرآن لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ کر سناتے ہیں۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ مگر وہ صبر کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب اس بستی میں الرسالہ کی باقاعدہ ایجنسی قائم ہو گئی۔ کئی درجن پرچے وہاں ہر ماہ جا رہے ہیں۔ متعدد افراد نے اسلامی مرکز کی کتابوں کا پورا پورا سٹ خریدنا اور پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

۷. حیدر آباد میں ہر سال آل انڈیا صنعتی نمائش نہایت اہتمام سے منعقد ہوتی ہے۔ اس موقع پر "ادبی ٹرسٹ" حیدر آباد کی طرف سے کتابوں کا اسٹال بڑے پیمانہ پر لگایا جاتا ہے۔ پچھلے سال کی نمائش میں انھوں نے اپنے اسٹال پر اسلامی مرکز کی مطبوعات بھی رکھی تھیں۔ اس سال جنوری۔ فروری ۱۹۸۵ کی نمائش میں دوبارہ ادبی ٹرسٹ نے اسلامی مرکز کی تمام کتابیں منگوا کر اسٹال پر رکھیں۔ یہ کتابیں چند ہی روز میں فروخت ہوگئیں۔ اس کے بعد ان کا دوسرا آڈر ملا اور فوراً دوسرا زیادہ بڑا پارسل روانہ کیا گیا۔ ادبی ٹرسٹ کی رپورٹ کے مطابق "اسلامی مرکز کی کتابوں کی مانگ نمائش کے موقع پر بہت ہی اچھی رہی۔"

۸. اسلامی مرکز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ الرسالہ کا ماہانہ عربی اڈیشن جاری کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت خدا کے بھروسہ پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یکم اپریل ۱۹۸۵ تک عربی الرسالہ کا پہلا شمارہ چھپ جائے گا۔ اس کے بعد مرکز کا اگلا منصوبہ الرسالہ کے ہندی اڈیشن کے اجراء کا ہے۔ اس طرح ان شاء اللہ ہر ماہ الرسالہ چار اہم زبانوں (اردو، عربی، انگریزی، ہندی) میں نکلا کرے گا۔ جو لوگ الرسالہ کے عربی اڈیشن سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ خریداری یا ایجنسی کے لئے تحریر فرمائیں۔

۹. الرسالہ کے پھیلے ہوئے حلقوں کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو مسلسل دعوت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی خواہش ہے کہ وہ موصوف کی تحریریں پڑھنے کے ساتھ موصوف کی آواز بھی سن سکیں مگر صدر اسلامی مرکز اپنی بڑھی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے بیرونی مقامات کے دوروں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ اس کی تلافی کے طور پر یہ طے کیا گیا ہے کہ کیسٹ میگزین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ ان شاء اللہ ماہانہ کیسٹ کی صورت میں تیار کیا جائے گا اور اس کا نام "اسلامی آواز" ہوگا۔ کیسٹ میگزین کے اس پروگرام کے تحت ہر ماہ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کی جائے گی۔ اور پھر اس کی نقلیں تیار کر کے خواہش مند حضرات کو ہر ماہ بر قیمت روانہ کیا جائے گا۔ جو لوگ اس سلسلہ کے مستقل خریدار بننا چاہتے ہیں وہ ہم کو بذریعہ خط مطلع فرمائیں۔

۱۰. نئی دہلی کے میگزین انٹرنیشنل کوریئر (International Courier) کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۹ فروری ۱۹۸۵ کو اسلامی مرکز میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس کا خلاصہ ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔

اِسلام اور عصرِ حاضر

"اسلام عصرِ حاضر میں" ویسا ہی ایک جملہ ہے جیسا کہ "سورج عصرِ حاضر میں"۔ اسلام بالفاظِ دیگر خدا کی سچی ہدایت، ابدی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کی مادی تعمیر کے لئے جس طرح سورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لئے خدا کی سچی ہدایت (اسلام) کی لازمی ضرورت ہے۔

جو لوگ اسلام کو نہ اپنائیں وہ گویا روحانی اور اخلاقی معنوں میں اسی نادانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو وہ شخص کرے گا جو اپنی زندگی کی مادی تعمیر اس طرح کرے کہ اس نے سورج کو اپنی فہرست سے حذف کر دیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ سورج کے بغیر آدمی کی دنیا اندھیری ہے اور ہدایت کے بغیر آدمی کی آخرت اندھیری۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

فارم IV

ماہنامہ الرسالہ۔ سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۱۔ مقام اشاعت سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۶۔ نام اور پتہ مالک الرسالہ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

میں ڈاکٹر ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں
یکم مارچ ۱۹۸۵ء

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

March 1985
Number 100

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128